فقہ اسلامی کی ابتدائی تشکیل کا تاریخی جائزہ

* ڈاکٹر محمد ریاض خان الازہری

* ڈاکٹر سلیم الرحمان

فقہ اسلامی کی لغوی واصطلاحی تعریف:

لفظ ''فقہ'' کے لغوی معنی ((العلم بالشیء والفهم له))(1) یعنی کسی شے کا جاننا اور سمجھنا ہے۔ قرآن مجید میں اس لفظ کے استعمال سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے مراد مطلق علم وفہم اور سمجھنا نہیں، بلکہ لطیف ادراک، دقیق فہم اور متکلم کی غرض کی صحیح معرفت ہے۔ اللہ کے نبی حضرت شعیب علیہ السلام نے جب قوم کو صراط مستقیم کی طرف دعوت دی تو جواباً قوم نے کہا:

((مَانَفْقَهُ كَثِيراً مِّمَا تَقُوْلُ))(2)

''ہم آپ کی اکثر باتوں کو نہیں سمجھ پاتے''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالی سے دعا مانگی:

''وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ''(3)۔

اے اللہ! میری زبان کی گرہ کھول تا کہ آل فرعون میری بات اور مراد کو سمجھ سکے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ علامہ جرجانی نے فقہ کے لغوی معنی ''متکلم کے کلام سے اس کے مقصد اور غرض کو سمجھنا'' لئے ہیں:

((الفقه هو فی اللغة فهم غرض المتكلم من كلامه))(4)۔

''کسی شے کو سمجھنے اور جاننے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے پردہ اٹھایا جائے اور راس کو کھول دیا جائے، تا کہ صحیح اور غلط کو الگ کیا جا سکے'' چنانچہ علامہ جار اللہ زمخشری (متوفی 538ھ) نے کہا:

((الفقه حقيقته الشق والفتح والفقيه الذی يشق الأحكام ويفتش عن حقائقها ويفتح مااستغلق منها))(5)۔

''فقہ کی حقیقت کسی شئی کا چیرنا اور کھولنا ہے چنانچہ فقیہ وہ شخص ہے جو احکام کا تجزیہ کرتا ہے اور ان کے حقائق کی تفتیش کرتا ہے اور مبہم اور مغلق کو کھول کر واضح کرتا ہے۔''

---

* لیکچرار شعبہ علوم اسلامیہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد۔

* لیکچرار شعبہ تھیالوجی اسلامیہ کالج چارٹرڈ یونیورسٹی پشاور خیبر پختونخواہ۔

اسلام سے قطع نظر اہل عرب کے ہاں لفظ فقہ اپنے لفظی قالب میں مطلق علم وفہم کے معنی میں عام علوم وفنون میں استعمال کیا جاتا تھا، جس میں کسی خاص علم وفن کی تخصیص ملحوظ نہ ہوتی، چنانچہ عربی لغت میں جاننے والے کو ''فقیہ'' اور زیادہ علوم میں مہارت رکھنے والے کو ''فقیہ العرب'' اور ''عالم العرب'' کہا جاتا تھا(6)۔ اسلام کی آمد کے بعد اس کی تخصیص کر دی گئی اور علم شریعت پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔ علامہ جوہری (متوفی 393ھ) فرماتے ہیں:

((الفقه الفهم ثم خص به علم الشريعة))(7)۔

''اور یہ تخصیص علم شریعت کی عظمت وفضیلت کی وجہ سے عمل میں لائی گئی''۔

((وغلب على علم الدين لسيادته وشرفه وفضله على سائر أنواع العلم))(8)۔

''علم کے تمام انواع پر شرف وفضیلت کی وجہ سے فقہ کا اطلاق علم دین پر غالب ہوا''۔

صدرِ اوّل میں ازروئے عرف ''فقہ'' سے علم دین یا علم شریعت مراد لیا جاتا تھا، اور اس کا مفہوم نہایت وسیع اور اسلامی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا، جس کے ضمن میں عقائد، اخلاقیات اور عملی احکام سما جاتے۔ یہ تمام کلمات جب مطلقاً استعمال ہوتے تو اس سے مراد وہ تمام تعلیمات ہوتیں جو آپ ﷺ لے کر آئے، چاہے ان کا تعلق عقائد سے ہو یا اخلاق سے ہو یا عملی احکام سے (9) ارشادِ نبوی ﷺ ((من يرد الله به خيراً يفقهه في الدين))(10) کی تشریح کرتے ہوئے مُلّا علی قاری رحمہ اللہ کہتے ہیں:

((قوله يفقهه في الدين أي أحكام الشريعة و الطريقة والحقيقة ولا يختص بالفقه المصطلح المختص بالأحكام الشرعية الفرعية كما ظن))(11)۔

''آپ ﷺ کے ارشاد (کہ اللہ تعالیٰ جس کے بارے میں خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین میں فقاہت دیتا ہے) میں فقاہت فی الدین سے مراد شریعت، طریقت اور حقیقت کے احکام کا علم ہے۔ آپ ﷺ کا یہ ارشاد صرف مروج علم فقہ کے ساتھ مخصوص نہیں کہ اس کا فقط فروعی احکام کے ساتھ اختصاص پایا جائے، جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے''۔

قرآن وسنت میں لفظ ''فقہ'' اکثر وبیشتر اس عمومی مفہوم میں وارد ہوا ہے، جس میں فقہ کی نسبت پورے دین کی طرف کی گئی ہے، صرف عملی اور فروعی احکام کے ساتھ اس کو مخصوص نہیں کیا گیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾(12)۔

''سو کیوں نہ نکلا ہر جماعت میں سے ایک حصہ تا کہ سمجھ پیدا کرے دین میں''۔

نبی کریم ﷺ نے عبداللہ بن عباسؓ (متوفی ۶۸ھ) کے حق میں دُعا کی:

((اللهم فقهه في الدين))(13)۔ ''اے اللہ، اسے دین میں فقاہت سے نواز دے''۔

نبی کریم ﷺ نے تفقہ فی الدین کی غرض سے آنے والے طالبان دین کے حق میں انصار کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

((إن رجالاً یأتونکم من الأرض یتفقهون فی الدین فإذا أتوکم فاستوصوا بهم خیراً))(14)۔

''کچھ لوگ تمہارے پاس مختلف علاقوں سے تفقہ فی الدین کے لئے آئیں گے جب وہ آئیں تو تمہیں میری نصیحت ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا''۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((نضر اللّٰہ امرأ سمع منا حدیثاً فحفظه حتی یبلغه فرب حامل فقه إلی من هو أفقه منه ورب حامل فقه لیس بفقیه))(15)۔

''اللہ تعالی سرسبز وشاداب رکھے اس شخص کو جس نے ہم سے حدیث سنی اور اس کی حفاظت کی یہاں تک کہ اس کی تبلیغ کی اور آگے پہنچائی، اس لیے کہ بعض اوقات فقہ کے حامل سے وہ شخص زیادہ فقاہت کا مالک ہوتا ہے، جسے یہ روایت پہنچا رہا ہے، اور بہت سارے حاملین فقہ خود صاحب فقہ نہیں ہوتے''۔

اس حدیث میں غور وتدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فقیہ وہ شخص ہے جو دینی امور میں بصیرت رکھنے کے ساتھ ساتھ نصوص کے معانی ومطالب سمجھتا ہو اور ان عبرتوں اور فوائد کو نکال سکتا جن پر نصوص مشتمل ہیں، کلمات ''أفقه'' اور ''فقیه'' اس پر دال ہیں کہ افقہ وہ شخص ہے جو اللہ تعالی کی مراد یعنی دینی احکام وتشریعات جاننے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہو، جبکہ حامل فقہ میں مذکورہ امور کی اہلیت کم یا ناپید ہوتی ہے۔

آپ ﷺ نے قبیلہ بنو ہوازن سے ملنے والے ''مال غنیمت'' کو جب تقسیم کیا تو قریش کے جدید الإسلام لوگوں کو تالیف قلب کی غرض سے زیادہ حصہ دیا جس پر بعض انصار صحابہؓ نے چہ میگوئیاں کیں اس پر آپ ﷺ نے صورت حال کی وضاحت کے لئے انصار کو بلا کر ارشاد فرمایا:

((ما کان حدیث بلغنی عنکم: قال لهم فقهائهم : أما ذوو رأینا یا رسول اللّٰہ ﷺ فلم یقولوا شیئاً))(16)۔

کہ آپ حضرات کی طرف سے مجھے کیا خبر پہنچ رہی ہے، تو انصار کے فقہاء یعنی اہل علم نے کہا، کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہم میں سے سمجھ دار لوگوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ یحیٰی بن سعید انصاری (متوفی ۱۴۳ھ) جنہوں نے کبار تابعین کو دیکھا فرماتے ہیں:

((ماأدرکت فقهاء أرضنا إلا یسلمون فی کل ثنتین من النهار))(17)۔

قرآن وسنت سمیت ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ، فقیہ، فقہاء کے کلمات آپ ﷺ اور صحابہ وتابعین کے زبانوں پر

جاری تھے۔ اوران سے مرادعلم دین یا قرآن وسنت کی تعلیمات اوران کے معانی ومفاہیم اوراحکام کے جاننے والے افراد ہوتے تھے، اورفقہ کا مفہوم تمام دینی تعلیمات کوشامل تھا، کسی خاص حصہ کے ساتھ اس کی تخصیص اورتحدید نہیں کی گئی تھی، چنانچہ اس زمانے میں فقیہ فروعی احکام سے پہلے اصول وعقائد اورعملی احکام سے پہلے باطنی اصلاح اورتزکیہ نفس کا اہتمام کرتا تھا۔ اورفقہ کا اطلاق اعتقادات، اخلاقیات اورظاہری اعمال پر ہوتا تھا۔

((إن الفقه فی الزمان القديم كان مُتنا ولاً لعلم الحقيقة و هی الإلٰهيات من مباحث الذات والصفات وعلم الطريقة وهی مباحث المنجيات والمهلكات وعلم الشريعة الظاهرة))(18)۔

''زمانہ قدیم میں فقہ علم حقیقت' (الہیات یعنی اللہ کی ذات وصفات کے مباحث) علم طریقت' (یعنی ہلاکت یانجات دینے والے اوصاف واخلاق کے مباحث) اورعلم شریعت ظاہرہ سب کوشامل تھا''۔

بالفاظ دیگر فقہ کا دائرہ علم الکلام، علم التصوف اورعلم الاحکام سب کوشامل تھا، صرف فروعی احکام ومسائل پر علم فقہ کا اطلاق زمانہ مابعد کی پیداوار ہے۔

چنانچہ اس عہد میں اس لحاظ سے عقائد پر لکھی گئی امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کتاب کا نام **الفقه الأكبر** رکھا گیا(19) اور فقہ کی جواصطلاحی تعریف کی گئی اس میں بھی اس مفہوم کی وسعت واحاطہ کوملحوظ رکھا گیا۔ اورفقہ کی تعریف یہ سامنے آئی:

((الفقه معرفة النفس مالها وما عليها))(20)۔

فقہ نفس کونفع پہنچانے والے اورنقصان پہنچانے والے امور کے پہچاننے کے علم کا نام ہے یعنی زندگی کے ہر شعبے (عقیدہ، اخلاق یا عمل) میں حق وباطل، حلال وحرام اورمفید ومضرامور کے درمیان فرق وامتیاز کرنے کی صلاحیت کا نام فقاہت ہے۔

فقہ کی اصطلاحی تعریف کا یہ پہلا مرحلہ تھا۔ اس کے بعد ''علم فقہ'' اپنی اصطلاحی تعریف کے دومزید مراحل سے گزرا۔ اہل اسلام پر جب یونانی منطق وفلسفے کی یلغار شروع ہوئی جس کے اثرات کی وجہ سے عقائد کی سادگی ختم ہوئی اورعقائد کے مباحث گنجلک اور پر پیچ بن گئے تو عقائد کے علم نے ایک علیحدہ علم وفن کی حیثیت پائی اورعلم الکلام (21) کے نام سے اسے شہرت حاصل ہوئی ۔تاہم اس مرحلہ میں بھی وجدانیات کا تعلق فقہ ہی سے قائم رہا اوروجدانی مباحث (جن کا تعلق ملکات نفسانیہ سے ہے) کوفقہ میں شمار کیا گیا، مثلاً یہ قول: **إن تحريم الحسد والريا من الفقه**(22) حالانکہ حسد وریا اوراس قسم کی تمام برائیوں کا تعلق ملکات نفسانیہ سے ہے جن کے ازالے کے لئے صرف علم فقہ کافی نہیں بلکہ خاص قسم کی تربیت درکار ہے، چنانچہ اس دور میں فقہ کی تعریف کے اندر اس بات کا خصوصی لحاظ رکھا گیا اورفقہ کی تعریف یوں کی گئی۔

((العلم بالأحكام الفرعيةالشرعية المستمدة من أدلتها التفصيلية))(23)۔

اس تعریف میں فرعی احکام سے مراد وہ احکام ہیں جو اصول وعقائد سے متعلق نہ ہوں جن پر دوسرے شرعی احکام کا دارومدار ہوتا ہے بلکہ وہ فرعی احکام مراد ہیں جن کا تعلق اعضاء وجوارح سے ہو، نیز وہ احکام بھی مراد ہیں جن کا تعلق قلب ونفس سے ہو، مثلاً ریاء، کبر، حسد اور عُجب کا حرام ہونا، اور تواضع وغیرہ کا حلال ہونا، گویا اس دور میں علم اور تربیت اور درسگاہ وخانقاہ کے درمیان چولی دامن کا ساتھ رہا اور دونوں امور بیک وقت سرانجام دیے جاتے رہے۔

علم فقہ کی تعریف کا تیسرا مرحلہ اس وقت آیا جب درسگاہ اور خانقاہ کے نظام عمومی طور پر علیحدہ ہوگئے تو وجدانیات نے بھی علیحدہ فن کی حیثیت حاصل کی اور علم التصوف یا علم الاخلاق کے نام سے مشہور ہوا، اور یوں اس مرحلہ میں علم فقہ کے دائرہ عمل سے عقائد اور اخلاق کے مباحث نکل گئے اور فقہ کا اصطلاحی مفہوم ان مسائل ومعاملات تک محدود ہوگیا جو انسان کو زندگی میں عملاً پیش آتے ہیں جس کے نتیجے میں عقائد، علم الکلام اور علم العقائد کے عنوان سے دینی علم کا ایک جدا شعبہ قرار پائے۔ وجدانی امور تصوف اور علم الاخلاق کا حصہ بن گئے اور فقہ کا جو اصطلاحی مفہوم مقرر ہوا اور علماء کرام نے ملے جلے الفاظ میں، جن کا مفہوم ومصداق تقریباً ایک ہے، فقہ کی تعریف کی اور یہ تعریف متفق علیہ بنی:

((العلم بالأحكام الشرعية العملية من أدلتها التفصيلية))(24)۔

خلاصہ یہ کہ متقدمین اور سلف صالحین نے فقہ کی تعریف عمومی الفاظ میں کی، اور اسے فروعی اور عملی احکام کے ساتھ مخصوص نہیں کیا لیکن متاخرین نے فقہ کو عملی احکام کے ساتھ مخصوص کر دیا، جب کہ فخر الإسلام البزدوی (متوفی ۴۸۲ ھ) نے فقہ کے اصطلاحی اور شرعی مفہوم میں تین اجزاء کو شامل کیا:

((۔۔۔۔۔الفقه وهو ثلاثة أقسام علم المشروع بنفسه ،القسم الثاني إتقان المعرفة به وهو معرفة النصوص بمعانيها و ضبط الأصول بفروعها والقسم الثالث هو العمل به حتى لا يصير نفس العلم مقصودا فإذا تمت هذه الأوجه كان فقها))(25)۔

"علم الفروع فقہ سے عبارت ہے فقہ کے تین اجزاء ہیں ایک نفس احکام کا علم، دوسرا اس علم کی پختگی یعنی نصوص کے معانی وعلل کی معرفت اور اصول کا فروع پر انطباق اور تیسرا جز، ان احکام پر عمل کرنا ہے تاکہ علم بذات خود مقصود نہ بن جائے۔ جب یہ تینوں اجزاء مکمل ہوجائیں تو انسان صاحب فقہ اور فقیہ بن جاتا ہے"۔

مسلم الثبوت کے مصنف علامہ محبّ اللہ بہاری (متوفی 1119 ھ) نے امام بزدوی (متوفی 482 ھ) سے اختلاف کرتے ہوئے فقہ کے مفہوم میں عمل کو شامل کرنے پر اعتراض کیا۔ لیکن علامہ عبدالعلی بحر العلوم (متوفی 1225 ھ) نے امام بزدوی کا دفاع کرتے ہوئے لکھا کہ اصل بحث یہ نہیں کہ فقہ کے لغوی واصطلاحی مفہوم میں عمل شامل ہے یا نہیں بلکہ اصل بحث یہ ہے کہ جس فقہ کی

شارع اور صحابہ و تابعین نے مدح و تعریف کی ہے وہ کیا چیز ہے، اور اس اعتبار سے فخر الاسلام بزدوی کی بات درست ہے کیونکہ فاسق مدح و تعریف کا مستحق نہیں ہے اور فاسق کو غیر فقیہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے۔ حجاج بن یوسف (متوفی 85ھ) کو کسی نے بھی فقہاء میں شمار نہیں کیا حالانکہ وہ احکام کو دلائل کے ساتھ جانتا تھا(26)۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ دین کا وسیع اور تحقیقی علم رکھنے کے باوجود فسق و فجور میں مبتلا ہوں وہ فقہاء کہلانے کے مستحق نہیں بلکہ ایسے لوگوں کو قرآن نے سفہاء کا نام دیا کیونکہ علم بلا عمل فقاہت نہیں بلکہ سفاہت اور حماقت ہے۔ مزید برآں اسلامی تعلیمات کی رو سے علم اور فقہ بذات خود مقصود نہیں بلکہ عمل کی تصحیح اور ادائیگی کے پیش نظر مطلوب ہیں۔ گویا علم فقہ کا موضوع انسانی اعمال و افعال میں ہر فعل کا حکم شرعی دلیل کے ساتھ اس طرح معلوم کرنا ہے کہ یہ فعل و عمل جائز ہے یا ناجائز، حلال ہے یا حرام، مستحب ہے یا مکروہ (27)۔ اس نہج پر مفصل دلائل کے ساتھ ایک متعین اور مخصوص معاملہ کا حکم جاننے کی بھرپور سعی کرنا اجتہاد ہے اور اس سعی و کوشش سے جو عملی حکم یا مجموعہ احکام دلائل کے ساتھ یا مآخذ اور ماخوذ معلوم ہو وہ فقہ یا علم الفقہ قرار پائے گا۔ غرض فقہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی اور ایک انسان کے دوسرے انسان سے تعلقات و روابط سے متعلق جملہ افعال پر مشتمل ہے اور اسلامی زندگی کا کوئی عملی پہلو فقہ کے دائرے سے خارج نہیں۔

فقہی مذاہب کا تشکیلی پس منظر:

علم الفقہ شریعت کے تمام عملی احکام کے مجموعے کا نام ہے جس میں عبادات، معاملات، مناکحات، عقوبات، مخاصمات اور حکومت و عدالت کے مسائل اپنے تمام تر ضمنی تفصیلات کے ساتھ شامل ہیں۔ بحمد اللہ ان مسائل کا قابل قدر اور قابل عمل عظیم ذخیرہ امت مسلمہ کے پاس مذاہب اربعہ کی شکل میں مدوّن اور مرتب شکل میں موجود ہے، جو منصوص اور غیر منصوص اجتہادی احکام پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتداء اگرچہ اسلام کی آمد کیساتھ ہوئی تاہم ظاہر ہے کہ یہ دفعۃً وجود میں نہیں آیا اور نہ دفعۃً ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ اور ایک دور سے دوسرے دور میں منتقل ہوا۔ بلکہ حالات و اسباب کی مناسبت سے تاسیس کے بعد اس نے بتدریج ترقی کر کے وسعت اختیار کی اور مختلف مراحل سے گزر کر فقہی مذاہب کی شکل میں مرتب ہوا۔

ظہور اسلام کے وقت اہل عرب صحیح الہامی نظامِ فکر اور صالح نظامِ عمل سے محروم تھے۔ آباء واجداد سے ورثے میں ملے ہوئے خود ساختہ دین پر عمل کے ذویدار تھے، جس پر توہمات کا رنگ چڑھا ہوا تھا، ملت ابراہیمی کی تحریف شدہ بعض تعلیمات بھی رائج تھیں، امور زندگی کی تنظیم اور باہمی تنازعات کے تصفیے کے لئے ان کے پاس کچھ ضابطے تھے جو انہوں نے روزمرہ زندگی کے تجربات اور معروف رسم و رواج سے حاصل کیے تھے۔ ان تمام کے ہوتے ہوئے بھی ان کا دین ان کے تابع تھا، وہ اپنے دین کے تابع نہیں تھے۔ اور یوں باشندگان عرب چھٹی صدی عیسوی میں ایک بے ترتیب اور منتشر رجحانات کے حامل ایسے عربی قانون کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے، جس میں عرب کی معروف بنیادی قدروں کے عناصر اور رومی و ساسانی اور یہودی مذہب کے اثرات کا اختلاط تھا:

((إن البلدان العربية كان محكومة في القرن السادس بعد الميلاد بقانون متشعب الأطراف به عناصر من أسس عربية تعارف عليها العرب ،اختلطت بها أنواع من القانون الروماني والساساني واليهودي))(28)۔

قبائلی سرداری نظام کے زیر سایہ زندگی رواں دواں تھی جس میں خونی رشتہ کی اساس پر معاملات طے کیے جاتے تھے۔ یہی خونی رشتہ ایک طرف قبیلے کا دوسرے قبیلے کے ساتھ اختلاف اور اتفاق پر اثر انداز ہوتا، تو دوسری طرف قبیلے کو فرد اور فرد کو قبیلے کے ساتھ ملانے میں سبب وحید سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ کھانے پینے، لباس، ولیمے اور عید کے موقعوں پر کچھ رسوم ورواج تھے نکاح وطلاق بیع وشرا اور دیگر معاملات میں مخصوص تقالید موجود تھیں۔ ماں، بہن بیٹی جیسے محارم کو حرام سمجھا جاتا تھا۔ ظلم کے ازالے کے لئے کچھ سزائیں اور جنایت، دیت اور قسامت کے چند ضوابط موجود تھے (29)۔

یہ سزائیں اور ضابطے عرف ورواج میں موجود تھے، ان کی کوئی مدون شکل تھی اور نہ ان پر عمل درآمد کے لئے کوئی نظام تھا بلکہ اکثر طاقت ان ضوابط کی پاسداری میں رکاوٹ بن جاتی جس کی وجہ سے جنگل کا راج اور جہالت کا دور دورہ تھا۔ الغرض عرب اپنی تاریخ کے حوالے سے عہد جاہلیت سے گزر رہا تھا۔ عہد جاہلیت درحقیقت دو چیزوں سے تشکیل پذیر تھا۔

① عقائد ونظریات میں بت پرستی اور توہمات۔

② اجتماعی معاملات میں بدنظمی اور انتشار (30)۔

ان دونوں راستوں سے جہالت زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہو کر پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر تھی جس نے اہل عرب کو صحیح نظامِ فکر اور صالح نظامِ عمل سے محروم کر رکھا تھا۔ جہالت کے ان اندھیروں اور مفاسد سے نکالنے اور ہدایت کی روشنی اور رمنافع کی طرف لانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آخری ضابطہ ہدایت نازل فرمایا اور حامل کتاب ﷺ کو نمونہ عمل بنا کر بھیجا چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾(31)۔

آپ ﷺ نے جہالت اور اس کے مضمرات کے خلاف اعلان جنگ کر کے عملی تحریک کا آغاز کیا اور قول، فعل، تقریر اور بیان کے ہر مناسب اور مؤثر اسلوب کے ذریعے اپنا پیغام پہنچایا اور اپنے پیروکاروں کی فکری تربیت اور عملی اصلاح شروع کی۔ آپ ﷺ کی تعلیم وتربیت اور تبلیغ ودعوت کا سلسلہ تقریباً تئیس (۲۳) سال پر محیط ہے، جس میں آنحضرت ﷺ نے نظام فکر اور نظام عمل کے ہر ہر گوشے کے لئے نہ صرف ایک کامل معلم ومربی کی حیثیت سے ہمہ جہت اور ہمہ وقت راہنمائی کی بلکہ ایک مدبر حکمران کی حیثیت سے ان کو نافذ کروایا۔ مختصراً یہ کہ آپ ﷺ نے صحیح الہامی نظام فکر اور صالح نظام عمل دیا جس کی طرف عالم انسانی بالعموم اور اس وقت کے عرب بالخصوص محتاج تھے۔ نبی کریم ﷺ نے تقریباً تیرہ سال مکہ اور دس سال مدینہ میں گزارے، اول الذکر کو مکی اور مؤخر الذکر کو مدنی دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مکی دور میں آپ ﷺ نے ترجیحی بنیادوں پر نظام فکر اور عقائد کی اصلاح کی جب کہ

مدنی دور میں زیادہ تر نظام عمل کی تنظیم اور تسدید کی طرف متوجہ رہے (32)۔

نبی کریم ﷺ کی شدید خواہش کے باوجود اہل مکہ میں سے اکثر لوگوں نے آپ کے مشن کو قبول کرنے سے روگردانی کیے رکھی چنانچہ اللہ تعالی کے حکم کے مطابق آپؐ نے دعوت اسلامی کے مرکز ثانی مدینہ کی طرف ہجرت کی (33)

مکی دور میں وحی مجموعی طور پر عقائد اور اخلاقیات میں منحصر رہی، عبرت اور موعظت کے لئے کائنات اور مخلوقات میں غور وفکر کی طرف بار بار دعوت دی گئی۔ ترغیب اور ترہیب کے لئے اہل عرب کے ہاں معروف تاریخی قصص اور واقعات سے استشہاد کیا گیا۔ عملی احکام بہت کم نازل ہوئے اور یہ احکام بھی عقائد کی تکمیل کے لئے نازل ہوئے۔ اس دور میں قرآن کا دوتہائی سے کچھ کم یعنی ۳۰/۱۹ حصہ نازل ہوا (34)۔

مدنی دور میں قرآن مجید کے ایک تہائی سے کچھ زیادہ یعنی ۳۰/۱۱ حصہ نازل ہوا (35)۔ مدینہ آکر آپ ﷺ ایک نئی امت تشکیل دینے میں کامیاب ہوئے جس کی اخلاقی وروحانی اور سیاسی قیادت آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھی اور اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ گئی جس کی وجہ سے انفرادی عملی احکام سمیت جماعتی تنظیم اور باہمی معاملات حل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس نئی تشکیل پذیر امت کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق شرعی احکام پر مشتمل مکمل ضابطہ حیات ان کو دیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید نے عقائد اور اخلاقیات کے ساتھ ساتھ ان مقاصد کی طرف بھی توجہ دی اور انفرادی زندگی اور اجتماعی معاملات سے متعلق احکامات آنا شروع ہوئے، اور حالات کے تناظر میں شریعت اسلامی نے تشریعی اور فقہی انداز اختیار کیا، موقع ومحل کی مناسبت سے آیات الاحکام کا نزول شروع ہوا۔ یہ سلسلہ مدنی دور میں یونہی جاری رہا یہاں تک کہ آپ ﷺ کی وفات سے تین مہینے قبل اس وقت اختتام کو پہنچا جب سلسلہ آیات کی آخری کڑی میں عرفہ کے میدان میں ۹ ذی الحجہ کو بروز جمعہ تشریع اسلامی کی تکمیل کا اعلان کر دیا گیا (36)۔

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ (37)۔

آپ ﷺ کے عہد مسعود میں فقہ اسلامی وحی کی اساس پر قائم تھی اور تمام دینی، اخلاقی، سیاسی اور عملی امور کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ مہبط وحی کی حیثیت سے آپ ﷺ اس کے روح رواں تھے۔ اور آپ ﷺ ہی منصب افتاء پر سب سے پہلے فائز ہونے والی شخصیت، سید المرسلین، امام المتقین، خاتم النبین، اللہ کے بندے ورسول، وحی کے محافظ اور خدا اور بندگان خدا کے درمیان سفیر تھے۔ آپ ﷺ فتوی وحی الہی سے دیتے تھے اور یہ فتاویٰ جامع احکام پر مشتمل ہوتے اور واجب الاتباع ہونے میں قرآن کے بعد دوسرے نمبر پر آتے، کسی کو ان احکامات سے انکار کی گنجائش نہیں تھی (38)۔

چنانچہ قضاء وافتاء سے متعلق جملہ فرائض آپ ﷺ بنفس نفیس ادا فرماتے۔ بعض اوقات تعلیم وتمرین اور مشق و تربیت کی غرض سے صحابہ کرام سے یہ خدمت لیتے (39)۔ وہ علاقے جو مرکز اسلام سے دور واقع تھے اور جہاں کے باشندوں کے لئے ہر

وقت براہ راست آپ ﷺ سے رجوع کرنا ممکن نہ تھا وہاں آپ ﷺ ان ذمہ داریوں کی تکمیل کے لئے اپنے نائبین بھیجتے۔ چنانچہ اس سلسلے میں معاذ ؓ بن جبل (متوفی 18ھ) کو یمن بھیجا گیا(40)۔

تعلیم وتربیت کی غرض سے مسجد نبوی کے ساتھ ایک چبوترے (صفہ) میں باضابطہ طور پر علمی مرکز قائم ہوا، جس میں صحابہ کرامؓ ((تفقه فی الدین)) کی دولت سے مالا مال ہونے کے لئے آتے تھے، یہ ایک اقامتی درسگاہ تھی، جس میں استفادہ کرنے والوں کی تعداد بیک وقت کبھی اسّی، اور کبھی پچاسی تک پہنچ جایا کرتی تھی، صرف انصار میں سے ستر آدمیوں نے اس میں باضابطہ داخلہ لیا تھا(41)۔ آپ ﷺ اس درسگاہ میں فقہ اسلامی کے معلم اول تھے۔ تفقہ فی الدین یعنی دین میں سمجھ بوجھ پیدا کرنے کا پہلا کام آپ ﷺ نے سرانجام دیا، اور صحابہ کرامؓ حفظ آیات کے ساتھ ان کے احکام کو بھی سیکھتے رہے، اور ان پر عمل پیرا ہوتے رہے۔

لیکن اس مرحلہ میں مسلمان تعداد میں کم تھے نئے داخل ہونے والوں کی تعداد بھی مابعد کے ادوار کی نسبت سے کم ہوا کرتی تھی۔ زندگی سادہ اور مسائل محدود تھے۔ پیچیدہ قسم کے واقعات اور مسائل کم ہی پیش آتے تھے، پھر بھی اگر کوئی مسئلہ پیش آتا تو آپ ﷺ رہنمائی کرتے یا جب کبھی صحابہ کرامؓ استفسار کرتے تو آپ ﷺ مسئلہ کا حکم بیان فرماتے تھے، ان حالات واسباب کی وجہ سے فقہ پر واقعیت اور عملیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا، لفظ فقہ کا اطلاق نصوص شریعت یعنی قرآن وسنت کے عمومی مفہوم پر ہوتا تھا چاہے ان کا تعلق عقائد سے ہو یا اخلاقیات اور عملی احکام سے ہو فقہاء کو قراء کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا(42)۔

آپ ﷺ چونکہ بذات خود امت میں موجود تھے، اس لیے تمام پیش آمدہ مسائل میں آپ ﷺ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ آپ ﷺ وحی کی روشنی میں ان کا حل بتلاتے تھے اور وحی کی دونوں قسموں متلو وغیر متلو کو بروئے کار لاتے تھے(43)

عہد نبوی میں فقہ اسلامی کے گویا دو بنیادی مآخذ سامنے آئے۔ اول قرآن مجید اور دوم سنت یا تشریحات نبوی، بلاشبہ عصر نبوت میں احکام الٰہی کی معرفت کا حقیقی سرچشمہ وحی تھا، لیکن اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے بعض مواقع پر خود بھی ''اجتہاد'' فرمایا، اور صحابہ کرامؓ کی بھی اجتہاد کی جانب راہنمائی فرمائی۔ نبی کریم ﷺ تمام امور میں اولاً وحی کا انتظار فرماتے اور یہ انتظار اس وقت تک کرتے جب تک مصلحت اور غرض حکم فوت نہ ہو، لیکن جب وحی کے ذریعے حکم نازل نہ ہوتا تو آپ ؐ اپنی رائے اور اجتہاد پر عمل فرماتے۔ آپ ﷺ کی اجتہاد کی مثالیں موجود ہیں چنانچہ بعض حضرات نے اجتہاد رسول اللہ ﷺ کو مصدر ثالث قرار دیا ہے(44)۔

بہر حال عہد نبوت میں اجتہاد کا دائرہ محدود رہا اور معاملات حرب اور افراد کے معاملات پر مشتمل رہا۔ ان معاملات میں بھی وحی کی راہنمائی موجود تھی اور صحابہ کرامؓ بھی جو اجتہاد کرتے اس میں اس اجتہاد کا مرجع وحی اور ذات نبوت ﷺ قرار پاتے۔ صحابہؓ کے اجتہاد کی تصویب وتغلیط کے لئے معیار آپ ﷺ کا فیصلہ ہوتا اس لیے آپ ﷺ کی موجودگی کے زمانہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجتہاد سنت ہی کے حکم میں ہوگا۔

اس طرح آپ ﷺ کے اجتہاد کی صحت وخطا بھی حقیقت کے اعتبار سے وحی پر موقوف ہوتی، اس لئے کہ عام مجتہد کے برعکس

نبی کے اجتہاد میں خطاء کا احتمال ہوسکتا ہے، لیکن اقرار علی الخطاء کا امکان نہیں ہوتا۔ وحی اگر تائید کرتی ہے تو ثابت اور حق ٹھہرتا ہے بصورت دیگر مردود سمجھا جاتا ہے، اس لیے نبی کا اجتہاد بھی وحی اور سنت ہی قرار پائے گا الگ سے فقہ اسلامی کا مصدر نہیں ہوگا۔ عہد نبوی میں مکہ اور مدینہ کے اندر جو عرف موجود تھا اس کو بھی فقہ اسلامی کا مآخذ سمجھا جاتا ہے(45)۔

((وهكذا مصادر التشريع في العهد النبوي ثلاثة ، العرف العربي القائم والاجتهاد والرأي من الرسول والوحي من عند الله تعالىٰ))(46)۔

فقہ اسلامی اور تشریع کے باب میں ''عرف'' سے اگرچہ صرف نظر نہیں کیا جاسکتا، بہت سارے فقہی مسائل کے ثبوت اور تغیر کا دار ومدار ''عرف'' پر ہے، لیکن عہد نبوی میں اس کو اصالۃً مصدر فقہ بنانا اس لیے مشکل امر ہے کہ اسلام اصلاح کے لئے آیا ہے، جو رواج اور عرف اس وقت موجود تھے، اسلام نے اسے اصلاحی اور انتقامی انداز سے دیکھا ہے، جو عرف و رواج اسلام کے اصول ومبادی اور مزاج کے مطابق تھا، اسلام نے اس کو قائم رکھا ہے، اور جو اس معیار پر پورا نہیں اترا اسلام نے اس کی اصلاح کی اگر قابل اصلاح تھا، بصورت دیگر بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ اس اعتبار سے عرف عربی کو بالذات مصدر تشریع نہیں کہا جاسکتا، اجتہاد رسول کی طرح ثانیاً اور بالعرض وحی کی تائید کے بعد مصدر کہلایا جاسکتا ہے۔

مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ عصر نبوت میں فقہ اسلامی کے اساسی، بنیادی اور حقیقی مصادر دو یعنی کتاب وسنت تھے، اجتہاد الرسول اور عرف مابعد کے ادوار کی طرح بالذات مصادر نہیں بنے تھے۔ اس عہد میں چونکہ وحی کا سلسلہ جاری تھا رہنمائی کے لئے آپ ﷺ بنفس نفیس موجود تھے، یا آپ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہونے والے فقہی استعداد کے مالک صحابہؓ موجود تھے اس لیے قیاس کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور قیاس کے عدمِ وجود کی وجہ سے اختلاف واتفاق وجود میں نہیں آئے تھے لہذا اجماع جو کہ متفقہ قیاس ہی کا نام ہے، کی بھی ضرورت نہیں تھی، بعد کے ادوار میں یہ دونوں مستقل فقہ کے مصادر قرار پائے۔

نبی کریم ﷺ کے انتقال کے بعد حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ بالترتیب خلافت کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ ﷺ کے عہد مسعود میں اسلام جزیرہ عرب تک محدود تھا، جبکہ خلفاء راشدین کے دور میں اسلام تیزی کے ساتھ پھیلتا چلا گیا۔ مسلمان فاتح بن کر قیصر وکسریٰ کی حکومتوں پر غالب آگئے اور بادشاہ کے قائم کردہ ان رکاوٹوں کو توڑ ڈالا جو اسلام کی دعوت کا راستہ روک رہی تھیں۔ چنانچہ مجاہدین کی شمشیرانہ تسخیر سے پہلے اسلام نے اپنی حکیمانہ تعلیمات کے ساتھ لوگوں کے دل ودماغ کو مسخر کیا۔ مصر، ایران، شام اور شمالی افریقہ اس وقت کی متمدن قومیں مسلمانوں کے زیر فرمان آگئیں اور مملکت اسلامیہ کے بڑے بڑے شہر مختلف قوموں اور نسلوں کے لوگوں سے بھر گئے۔ مفتوحہ علاقوں کی اکثریت حلقہ بگوش اسلام ہوئی اور مسلمانوں کا ان تمام علاقوں میں ان جدید الاسلام لوگوں کے ساتھ میل جول قائم ہوا۔ نومسلم دینی تعلیمات کی تحصیل اور قدیم مسلمان ان تعلیمات کی تعلیم وتبلیغ اور ان کے مطابق عملی تربیت کی طرف متوجہ ہوئے۔ خلافت اسلامیہ کے تمام شہروں میں مسلمانوں کا دیگر اقوام کے ساتھ اختلاط

ہونے لگا جس کے نتیجے میں ایسے رسوم ورواج سے واسطہ پڑا جوان کے لئے غیر مانوس تھے۔ایسی تقالید اور عادات سے واسطہ پیش آیا جن سے وہ نا آشنا تھے۔مفتوحہ علاقوں کی کثرت ،وسعت اور مختلف تمدنی طرز ہائے زندگی کی وجہ سے نت نئے انفرادی،معاشرتی ،اجتماعی اور سیاسی مسائل پیش آئے۔ان کے علاوہ داخلی، خارجی،اور دینی ودینوی معاملات کے لئے شرعی احکام کی ضرورت شدت اختیار کرگئی جن کے حل کی ذمہ داری کا بارِگراں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کندھوں پر آپڑا صحابہ کرام آپ ﷺ کے تربیت یافتہ تھے، یہ حضرات آپ ﷺ کے افعال کو مشاہدہ کرتے رہے، آپ ﷺ کے اقوال ،متعلقہ پس منظر میں سنتے رہے پیش آنے والے مسائل میں آپ ﷺ کی طرف رجوع کر کے جوابات حاصل کرتے رہے،اپنے تنازعات اور اختلافات میں آپ ﷺ کو حَکَم وقاضی تسلیم کر کے فیصلے کرواتے رہے،قرآن کے شانِ نزول اور حدیث کے شانِ ورود کے پس منظر میں آپ ﷺ کی تربیت سے فیض یاب ہوتے رہے،لیکن ان سب کچھ کے باوجود آپ ﷺ نے ان کے لئے کوئی مدون فقہ یا مرتب مجموعہ احکام نہیں چھوڑا جو کچھ آپ ﷺ نے ان کی راہنمائی کے لئے چھوڑا تھا وہ دوخزانے تھے:

((ترکت فیکم أمرین ماتمسکتم بھمالن تضلوا کتاب اللّٰہ وسنة نبیہ))(47)۔

لیکن کتاب وسنت کی تدوین نہیں ہوئی تھی ۔آپ ﷺ کے عہد مبارک میں قرآن سینوں میں محفوظ یا انفرادی طور پر مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس مکتوب حالت میں موجود تھا اگرچہ آپؐ نے اپنی حیات میں تمام آیات کریمہ کاتبین وحی سے لکھوائی تھیں تاہم انہیں ایک مصحف میں جمع نہیں کیا تھا۔خلفاء راشدین کے دور میں دومرحلوں میں قرآن مجید کی تدوین عمل میں لائی گئی، پہلے مرحلے میں خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں قرآن مجید کو ایک صحیفہ کی شکل میں مدون کیا گیا۔دوسرے مرحلے میں خلیفہ سوئم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں قرآن مجید کے سات اُحرف میں سے قریشی لہجے کو معیار بنا کر جمع کیا گیا اور اسی معیاری نسخے کی سات نقلیں بنا کر عالم اسلام کے مرکزی مقامات میں بھیجی گئیں اور یہ پابندی عائد کی گئی کہ آئندہ جتنے مصاحف پڑھے یا لکھے جائیں وہ سب اسی مصحف کے مطابق ہوں گے تاکہ کسی شخص کو آئندہ کسی صحیح قراءت سے انکار کرنے یا غلط قراءت پر اصرار کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے اور اگر کہیں قراءت میں اختلاف رونما ہو تو اسی مصحف کی طرف رجوع کر کے بآسانی رفع کیا جاسکے۔

فقہ اسلامی کے مصدر ثانی سنت وحدیث کی باقاعدہ تدوین عمل میں نہیں آئی تھی ۔اس سلسلے میں زبانی روایت اور قوت حافظہ کو استعمال میں لایا جاتا، چونکہ قرآن مجید تدوین کے مراحل سے گزر رہا تھا، کتابت کا فن بھی عام نہ تھا اس لیے قرآن کی کتابت اور حدیث کے حفظ پر زور دیا گیا تاکہ قرآن دلوں میں راسخ ہوجائے ،بالعموم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اور بالخصوص حضرت عمر کو یہ فکر دامن گیر رہی کہ قرآن وحدیث کا آپس میں اختلاط والتباس پیدا نہ ہو۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نبی کریم ﷺ کی طرف ان کہی باتوں کو منسوب کرنے کے معاملہ میں سخت ڈرایا (48)۔یہی وجہ ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کی روایات کم ہیں۔اس دور میں

قبولیت روایات کے لئے خاص شرائط مقرر ہوئیں۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کسی راوی سے حدیث اس وقت تک قبول نہ کرتے جب تک کوئی دوسرا شاہد اس کی تائید نہ کرتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ راوی سے اس کی روایت پر گواہ پیش کرنے کا مطالبہ کرتے اور خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ تو راوی سے حلف لیتے تھے (49)۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس شریعت اسلامی کے یہ دو سرچشمے تھے جب کہ اس کی تکمیل کا اعلان ہو چکا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا، کہ دو مصادر میں ہر زمان اور مکان کے لئے تمام جزئیات اور فروعات کی تفصیل اور موقع ومحل کی تعیین کر دی گئی تھی، بلکہ اجمالی حیثیت سے ہدایت الٰہی کی یوں تکمیل کر دی گئی، جس میں عقائد کے قواعد، تشریع وقانون سازی کے اصول اور اقتضاء ومصالح کے مطابق استنباط کے قوانین دیئے گئے جیسا کہ علماء اسلام نے ((اليوم أكملت لكم دينكم)) (50) کا محل ان تینوں کو قرار دیا ہے

((هو التنصيص على قواعد العقائد والتوقيف على أصول الشرع وقوانين الاجتهاد لا إدراج كل حادثة في القرآن)) (51)۔

دین الٰہی کی تکمیل کا مطلب یہ ہے کہ اس میں عقائد سے متعلقہ قواعد کی تصریح اور تشریع کے اصول بیان ہوئے ہیں، اور اجتہاد کے قوانین کی نشاندی کی گئی ہے، یہ نہیں کہ ہر جزوی واقعہ وحادثہ کا حکم قرآن حکیم میں موجود ہے۔ آپ ﷺ کے انتقال اور فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے کے بعد صحابہ کرامؓ کو ایسے نئے مسائل اور معاملات پیش آئے کہ ان کا حل قرآن وسنت میں ظاہری طور پر موجود نہ تھا، بلکہ ایسے اجمالی قواعد واصول اور جزوی تشریحات ان کے حل کے لئے موجود تھیں جو قرآن کریم کے نصوص اور آپ ﷺ کے قولی، عملی فرامین میں منتشر پائے جاتے تھے، لیکن یہ نصوص وفرامین بھی محدود تھے، جب کہ مسائل اور حوادث لامحدود تھے اس لیے ان غیر منصوص پیش آمدہ مسائل کے لئے قواعد شرعیہ کی روشنی میں شریعت کا مقتضیٰ اور محل معلوم کرنا ناگزیر تھا چنانچہ مسلمانوں نے غور وفکر اور تدبر واستنباط کا دروازہ کھولا، مسائل کے حل اور احکام کے استنباط کے لئے قرآن وحدیث کے منطوق اور مفہوم میں غور کرنے لگے تاکہ قرآن وحدیث کے اصول وکلیات کو حوادث کے ساتھ منطبق کر سکیں، مسائل کے حل کا یہ طریقہ ''اجتہاد'' ہی تھا جس کے جواز پر دربار نبوت سے اجازت نامہ جاری ہوا تھا۔

معاذ بن جبلؓ (متوفی ۱۸ھ) کو جب والی اور قاضی کی حیثیت سے یمن بھیجا جا رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر آپ کے پاس حل طلب قضیہ آجائے تو آپ کس طرح فیصلہ کریں گے۔ عرض کیا، کتاب اللہ کے مطابق اس کا فیصلہ کروں گا، ارشاد ہوا اگر کتاب اللہ میں نہ پا سکے تو؟ عرض کیا رسول اللہ کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا، ارشاد ہوا اگر یہاں بھی نہ پا سکے تو؟ عرض کیا تو اپنی رائے کے مطابق اجتہاد کروں گا۔ حضرت معاذؓ فرماتے ہیں آپ ﷺ نے زور کے ساتھ میرے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ:

''تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے رسول ﷺ کے فرستادے کو رسول اللہ کے ساتھ اس

چیز میں موافق کیا جس پر وہ راضی ہے (52)۔

خلفاء راشدین اور ان کے عہد میں صحابہ بہت کم اجتہاد عمل میں لاتے تھے، تاکہ عمومی اجتہادی ملکہ نہ ہونے کی وجہ سے دینی مسائل میں خطاء کا ارتکاب نہ ہو یا کم از کم ہو نیز عام لوگوں کو دینی مسائل اور شرعی معاملات میں غیر مقید رائے کے اظہار کا موقعہ نہ ملے۔ غیر مقید آزاد رائے کو قبول نہیں کیا جاتا تھا، لیکن اس کے باوجود اس دور میں شخصی، عائلی، اجتماعی، معاشرتی، اقتصادی اور بین الاقوامی معاملات کی صورت میں اجتہاد کے لئے وسیع میدان موجود تھا۔ صحابہ کرامؓ کے ہاں اجتہاد کی تین قسمیں پائی جاتی تھیں:

① قرآن وسنت کے نصوص کا بیان اور ان کی توضیح کے لئے اجتہاد۔

② قرآن وسنت میں مذکور یا اجماع سے ثابت شدہ نظائر پر قیاس کی صورت میں اجتہاد۔

③ قرآن وسنت کی روح اور ان میں بیان کردہ اصولوں پر اعتماد کرتے ہوئے اجتہاد بالرائے (53)۔

مسائل واحکام کے سلسلے میں غور فکر کے بعد فکر ونظر کے اسلوب میں اختلاف یا اتفاق اس کا لازمی نتیجہ ہے، چنانچہ اس دَور کے فقہاء کرام نے جب اجتہاد کیا تو اس میں اختلاف بھی کیا اور یہ بھی ہوا کہ اجتہاد کے بعد سب نے اتفاق کیا۔ اجتہاد میں اگر سب کا اتفاق ہوتا تو یہ اجماع کہلاتا۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ فیصلہ طلب معاملہ میں اہل علم کا جس بات پر اجماع ہو جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے قاضی شریح بن الحارث (متوفی 78ھ) کو لکھا:

((فان جاء ک ما لیس فی کتاب اللہ ولم یکن فیہ سنۃ من رسول اللہ فانظر ما اجتمع علیہ الناس فخذ بہ))(54)۔

اگر تیسرے پاس ایسا معاملہ آجائے جس کا حکم قرآن میں مذکور نہ ہو اور اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی کوئی سنت بھی معلوم نہ ہو تو جس حکم پر لوگوں (اہل علم) کا اجماع ہوا ہو، اسے تلاش کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرو۔

عہد نبوی ﷺ میں وحی ہی واحد مأخذ احکام تھی، اور اجتہاد واجماع مأخذ فقہ کی صورت میں بروئے کار نہیں آئے تھے کیونکہ اس وقت ان کی بحیثیت مأخذ ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے کہ اجتہادی غلطی کی اصلاح کے لئے وحی نازل ہو جاتی تھی، لیکن خلفاء راشدین کے دور میں قرآن وسنت کے بعد اجماع اور اجتہاد بالرائے فقہ کے دو مزید مصادر قرار پائے۔ اجتہاد بالرائے صحابہ کرامؓ کے درمیان معروف ومشہور تھا، اگرچہ اس کے حدود معالم واضح نہیں تھے، نہ صراحت کے ساتھ اس کے اصول وقواعد وضع کیے گئے تھے۔ رائے کا جو مفہوم صحابہؓ کے ہاں رائج تھا، علامہ ابن القیم (متوفی 751ھ) نے اس کی وضاحت کی ہے کہ ایسے کسی مسئلہ میں جس میں صواب وناصواب کے پہلو باہم معارض ہوں غور وفکر اور صحیح امر کی جانب رسائی کے لئے کوشش کے بعد جس بات پر قلب مطمئن ہو جائے وہ رائے ہے (55)۔ اور اس معنی میں بقول ابن القیم رائے کا دائرہ قیاس، استحسان اور استصلاح وغیرہ کو سمیٹتا ہے (56)۔

مصادر تشریع اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا طریقہ کار:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو سب سے پہلے اس کا حکم کتاب اللہ میں تلاش کرتے اگر اس میں حکم نہ پاتے تو رسول اللہ ﷺ کی سنت کی طرف رجوع کرتے۔ حضرت میمون بن مہران (متوفی 117ھ) فرماتے ہیں کہ:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی حل طلب مسئلہ آجاتا تو آپ رضی اللہ عنہ کتاب اللہ میں دیکھتے اگر کتاب اللہ میں حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرماتے۔ اگر قرآن کریم میں حکم موجود نہ پاتے تو اس معاملے میں آپ ﷺ کی سنت سے اگر حکم معلوم ہوتا تو اس پر فیصلہ فرماتے۔ اگر یہاں بھی حکم نہ ملتا تو مسلمانوں سے دریافت فرماتے کہ اس معاملہ میں آپ ﷺ کا کیا ہوا فیصلہ کسی کو معلوم ہے؟ اور بسا اوقات لوگ اس بارے میں آپ ﷺ کے فیصلہ کا تذکرہ کرتے''۔ ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اگر سنت نبوی میں بھی حکم نہ پاتے تو لوگوں کو جمع کر کے ان سے مشورہ طلب کرتے۔ جب ان کی رائے کسی فیصلہ پر متفق ہوجاتی تو اس پر فیصلہ کرتے۔ حضرت عمرؓ کا طریق کار بھی یہی تھا کہ جب قرآن وسنت میں حکم پانے سے عاجز ہوجاتے تو دریافت کرتے کہ حضرت ابوبکرؓ کا فیصلہ اس ضمن میں کیا ہے؟ اگر فیصلہ مل جاتا تو اسی کے مطابق عمل کرتے۔ بصورت دیگر اہل علم کو جمع کر کے ان سے مشورہ طلب کرتے۔ اہل علم کا جب کسی بات پر اتفاق ہوجاتا تو اس کے مطابق حکم فرماتے (57)۔

شیخین کے دور کے بعد ان کے فیصلوں سے بھی استناد کیا جاتا تھا، حضرت عبد اللہ بن عباس کا طرز عمل نقل کیا گیا کہ جب آپؓ سے پوچھا جاتا، تو اگر مسئلہ کا حکم کتاب اللہ میں ہوتا تو بتلا دیتے، اگر کتاب اللہ میں حکم نہ ملتا اور رسول اللہ سے منقول ہوتا تو بتادیتے۔ اگر کتاب اللہ میں بھی نہ ملتا اور نہ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہوتا مگر ابوبکرؓ وعمر رضی اللہ عنہم کا کوئی فیصلہ منقول ہوتا تو اس کے مطابق حکم جاری فرماتے۔ اگر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں نہ ملتا اور نہ ابوبکرؓ وعمرؓ سے منقول ہوتا تو اپنی رائے کے مطابق اجتہاد کرتے (58) سابقہ خلیفہ کے فیصلوں سے استفادہ کیا جاتا تھا، چنانچہ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ کے فیصلوں سے استدلال کرتے تھے، جب کہ یہی طریقہ خلیفہ سوئم حضرت عثمانؓ اور خلیفہ چہارم حضرت علیؓ المرتضی نے بھی اختیار کیا (59)۔

عمومی طور پر جب کسی مسئلہ میں مشورہ طلب کیا جاتا اور اہل علم مشورہ دیتے تو متفقہ فیصلہ کیا جاتا اور یہی اجماع کہلاتا تھا (60) پیش آمدہ مسئلہ کے حل کے لئے یہ حضرات قرآن وسنت کی تعلیمات کی روح کی رعایت کے ساتھ مصلحت عامہ اور شریعت کے مبادی واصول سے مطابقت رکھنے والے عرف کو بھی ملحوظ رکھتے تھے (61) تا کہ تدبر کے ذریعے کوئی ایسا حکم تلاش کیا جائے جو مقاصد شریعت سے قریب تر اور شریعت کے بتائے ہوئے عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے والا ہوتا کہ اس کے ذریعے سے شریعت کے مطلوبہ مصالح کی تکمیل ہوسکے۔ خلفائے راشدین کے دور کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اجتہادی آراء میں اتفاق اجماع ہوکر متفقہ فیصلہ ٹھہرتا، اگر اختلاف ہوجاتا تو ہر ایک رائے کی نسبت اپنی طرف کرتا۔ اور اجتہادی حکم کو جزماً اللہ تعالی کا حکم قرار نہیں دیا

جا تا تھا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے کسی مسئلہ میں اجتہاد کر کے فیصلہ جاری کیا اور فرمایا:

((أجتهد برائی فإن يكن صواباً فمن الله وإن يكن خطأ فمنی وأستغفر الله))(62)۔

کسی مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کر کے فیصلہ دیا اور پنے کاتب کو یہ الفاظ لکھنے کا حکم دیا:

((هذا ما رأى عمر فإن كان صواباً فمن الله وإن كان خطأ فمن عمر))(63)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک ایسی عورت کے بارے میں مہر مثل کا فیصلہ صادر کیا جس کا شوہر فوت ہوا اور بیوی کے لئے مہر مقرر نہیں ہوا تھا۔ اور فرمایا:

((فإن يكن صواباً فمن الله عزوجل وإن يكن خطأ فمنی ومن الشيطان والله عزوجل ورسوله بريئان))(64)

حضرات صحابہ کرامؓ اجتہادی رائے کو جزماً ''حکم اللہ'' کا درجہ نہیں دیتے تھے، چنانچہ حضرت عمرؓ کے سامنے کسی شخص نے کسی معاملہ میں حضرت علیؓ کی رائے کا حوالہ دیا، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر میں ہوتا تو یہ فیصلہ کرتا، اس پر اس شخص نے کہا کہ آپ امیر المؤمنین ہیں آپ اب بھی ایسا کر سکتے ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر بات قرآن وسنت کی ہوتی تو میں ضرور کرتا، لیکن یہ معاملہ رائے کا ہے مجھے نہیں معلوم کہ کونسی رائے حق اور درست ہے(65)۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو ان حضرات کے درمیان رائے کے بارے میں تعصب کے فقدان اور ایک دوسرے کی رائے کے احترام پر دلیل ہے اور عام مسائل میں یہی طریقہ کار تھا کبھی کبھی دینی بنیاد پر ایک دوسرے کی رائے کی طرف رجوع کرتے اور یوں اختلاف جاتا رہتا جب کہ بسا اوقات ہر ایک اپنی رائے پر قائم رہتا اور یوں ایک مسئلہ میں کئی اقوال اور موقف سامنے آتے اس طرح ان حضرات کی فقہی آراء اور اسالیب بعد میں نقل ہوتے رہے، کبھی دلائل کے ساتھ اور کبھی بغیر دلائل کے یہ سلسلہ جاری رہتا جس کو بعد میں آثار کا نام دیا گیا(66)۔ ان صحابہؓ سے جن تلامذہ نے اخذ و استفادہ کیا، انہوں نے اپنے اساتذہ کے اقوال واجتہادات کو جمع کیا اگر چہ یہ سب کچھ اپنی اصلی شکل میں ایک جگہ موجود نہیں تاہم روایات کی شکل میں اس کا خاطر خواہ حصہ منتقل ہوا۔

خلفائے راشدین کے دور کی خصوصیات:

اس دور کے نمایاں خصوصیات کا تعلق زیادہ تر فقہ سے نہیں بلکہ مصادر فقہ سے ہے، ان خصوصیات کے دو پہلو ہیں:

اول: ان واقعات ومعاملات میں جن کے احکام پہلے سے اجتہاد کی روشنی میں مستنبط نہیں کیے گئے تھے ان کے احکام کے استنباط کے لئے رائے اور اجتہاد کا نمایاں استعمال۔

دوئم: اصول اجماع کا بروئے کار آنا، چونکہ پہلے دو خلفاء حضرات ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کا طریق کار یہ تھا کہ وہ مختلف

واقعات اور حوادث میں صحابہ کو جمع کرتے تھے اور ان سے فتویٰ لیتے اور جس امر پر موجود صحابہؓ کا اتفاق ہو جاتا تو اس پر عمل کرتے تھے

خلفائے راشدین اور بالخصوص پہلے دو خلفاء کے دور میں ایک اہم خصوصیت یہ رہی کہ ایک ہی مسئلہ میں اختلافی آراء کی صورت میں کوئی افتراق پیدا نہ ہوا اور نہ گروہ بندی کا کوئی تصور آیا جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ حضرات خلیفہ پر اعتماد کرتے تھے اور باہمی مشاورت سے کسی فیصلہ تک پہنچنے کی راہ نکالتے تھے۔

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ جلیل القدر صحابہ کرامؓ کو دار الخلافہ سے باہر جانے سے منع کرتے تھے، تاکہ کوئی اہم مسئلہ اگر درپیش ہو تو اس پر باہمی مشاورت کی جائے اور اس کا حل نکالا جائے۔ ایسے ہی صحابہ کرامؓ فتوی دینے میں زیادہ جری اور جلد باز نہیں تھے (67) کیوں کہ یہ حضرات کسی چیز کا علم رکھے بغیر فتوی دینے کا وبال آپ ﷺ سے سن چکے تھے۔ اسی طرح مفتوحہ جتنے علاقے اسلامی خلافت میں داخل ہوئے ان کے رسوم ورواج نہ تو سب کے سب شریعت میں موجود تھے، اور نہ ان کو بیک جنبش قلم مٹایا جاسکتا تھا جب کہ ان کے نتیجے میں پیش آنے والے تمام نو پید مسائل کے حل کے لئے اجتہاد ضروری تھا، تاہم اجتہاد کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا کہ حتی الوسع اتفاق رائے کی صورت پیدا کی جائے تاکہ اختلاف رائے کی صورت کم از کم ہو۔ حضرات صحابہ کرامؓ فیصلہ و فتوی کے وقت عجلت سے کام نہ لیتے، جامع حل کی طرف پہنچنے کے لئے خاص طریقہ کار کی پیروی کرتے، پیش آمدہ اس مسئلہ میں غایت درجہ احتیاط، حتی الوسع اجتماعی فیصلہ کی کوشش، بصورت اختلاف دوسرے کی رائے کے احترام نے افتراق، گروہ بندی، اور تفرقہ بندی کے سامنے بند باندھے رکھا یہاں تک کہ اس انداز اجتہاد او راحتیاط نے مختلف فقہی مذاہب کے پیدا ہونے کا راستہ بھی روکے رکھا کیونکہ خلیفہ یا تو اجتماعی فیصلہ کو اپناتا یا اکثریتی فیصلہ کو اختیار کرتا یا اپنی رائے کو ترجیح دینے کا مجاز سمجھا جاتا تھا۔ الغرض اس دور میں چونکہ آراء پر نظر ثانی کا طریقہ رائج تھا اس لیے اختلاف رائے کی صورت میں جماعت بندی اور فرقہ بندی کا تصور پیدا ہونا ممکن نہیں رہا (جو مابعد کے ادوار میں رائج ہوا) خلفائے راشدین کے دور میں یہ حالت بالعموم خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے نصف خلافت تک قائم رہی۔ لیکن خلافت عثمانی کے نصف ثانی میں حالات میں تبدیلی آئی اور خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کے دور خلافت میں جنگ صفین کے بعد مسئلہ تحکیم پیش آیا جس کے نتیجے میں مسلمان تین جماعتوں میں تقسیم ہو گئے:

① خوارج: یہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ (متوفی ۶۰ھ) دونوں کے خلاف تھے۔

② شیعہ: یہ حضرت علیؓ کے محبین کی جماعت تھی۔

③ جمہور معتدل امت جو ان دونوں کے علاوہ تھی۔

خوارج:

اس فرقے نے اس وقت جنم لیا جب "صفین" کے موقعہ پر حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے درمیان نزاع کے تصفیہ کے لئے ہر دو جانب سے حکم مقرر کیے گئے چنانچہ بعض لوگ حضرت علیؓ سے اس بنیاد پر الگ ہوئے کہ آپؓ اللہ تعالی کے فیصلے یعنی قرآن کے بجائے لوگوں کے فیصلے پر رضامند ہوگئے ہیں، ان لوگوں کا موقف تھا کہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ ہم نے جنگ اس یقین کے ساتھ شروع کی تھی کہ ہم حق پر ہیں اور حضرت معاویہؓ باطل پر ہے اس لیے کہ انہوں نے خلیفہ شرعی کے خلاف بغاوت اختیار کی ہے اور اس جیسے فرد کا حکم کتاب اللہ میں واضح طور پر موجود ہے، نئے سرے سے حکم بنانے کی کوئی ضرورت نہیں (68)۔ اب اس کے بعد جنگ چھوڑ کر دوسرے فیصلے کی طرف مائل ہونا شک ہے، اور شک اور ایمان آپس میں جمع نہیں ہو سکتے، ان لوگوں نے اپنے لیے بطور شعار نعرہ " إن الحكم إلا لله" اختیار کیا (69)۔ چنانچہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے علیحدگی اختیار کی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر عیوب لگائے۔ حضرت عثمان سے اس بنیاد پر براءت کا اعلان کیا کہ آپؓ شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ رضی اللہ عنہم کی سیرت پر نہ چل سکے۔ یہ لوگ امام وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کی وجہ سے خوارج کے نام سے موسوم ہوئے (70)۔

خوارج کی تحریک اگرچہ ابتداء اًسیاسی پس منظر میں شروع ہوئی تھی، لیکن رفتہ رفتہ عقیدہ اور عمل میں ان کے مخصوص افکار اور تعلیمات سامنے آئے اور اس طرح اس تحریک نے ایک مذہبی فرقہ کی شکل اختیار کی، جو افکار اور اعمال میں دیگر مسلمانوں سے مختلف ہے۔ ان کے افکار و اعمال میں بعض یہ ہیں:

① گناہ کا مرتکب کافر ہے۔ اس نظریہ کی وجہ سے حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی تکفیر کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں حضرت عثمانؓ نے شیخین سیدنا ابی بکرؓ و عمر رضی اللہ عنہم کی سیرت و سیاست کی مخالفت کی، اپنے خاندان والوں کو عزت و رعایت دی اور قومی حقوق و معاملات میں ان کو خاطر خواہ ترجیح دی۔ حضرت علیؓ حضرت ابوموسی اشعری اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کو مسئلہ تحکیم کی وجہ سے کافر سمجھتے تھے حضرت معاویہؓ سے براءت کا اعلان کرتے تھے، کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر خلافت پر زبردستی تسلط حاصل کیا۔

② ظالم امام کے خلاف ہر حال میں خروج واجب ہے۔ چاہے امام کی طاقت وقوت کتنی مضبوط اور ان کی طاقت کتنی کمزور کیوں نہ ہو یہ شیعہ حضرات کی طرح "تقیہ" (71) کے قائل نہیں۔

③ خلافت کی اہلیت کے لئے عربی، قریشی یا کسی خاص خاندان کا ہونا شرط نہیں، مسند خلافت پر وہ شخص فائز ہوگا جس کو مسلمان آپس میں پسند کر کے منتخب کریں، خلیفہ بننے کے بعد خلافت چھوڑنا یا حکم بنانا جائز نہیں۔ خلیفہ اگر انحراف کرے گا تو معزول کیا جائے گا اور اگر معزول ہونے سے انکار کرے تو قتل کیا جائے گا۔

④ اعمال ایمان کا جز ہے۔ ایمان کے لئے قلبی تصدیق یا زبانی اقرار کافی نہیں جب تک اعمال نہ ہوں (72)۔

اگرچہ خوارج کی باضابطہ فقہ مدون نہ ہو سکی لیکن ان کے افکار نے فقہ اسلامی پر اثرات ڈالے۔ یہ لوگ قیاس اور اجماع کو شرعی حجت تسلیم نہیں کرتے، اس لیے کہ قیاس و اجماع دونوں بالترتیب اشخاص یا جماعت کی رائے ہوتی ہیں۔ حدیث کے معاملہ میں یہ لوگ سخت گیر موقف رکھتے تھے۔ ان سے بہت کم وضع حدیث ثابت ہے، لیکن یہ لوگ صرف ان احادیث کو لیتے تھے جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم کے زمانے میں روایت کی گئیں۔ ان کے ہاں ان لوگوں سے احادیث کا لینا جائز نہیں جو افکار و معتقدات میں ان کے مخالف ہوں، اس معاملہ میں روایت کی اسنادی حیثیت کی قوت اور ضعف ان کے ہاں قابل غور نہیں ہوتی۔ ان کے ہاں رائے اور اجتہاد کے اندر خطا گناہ شمار ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ واقعہ جمل کے شرکاء پر لعن طعن سے باز نہ آتے۔ ان کے ایک غالی پیشوا نافع بن الازرق نے اپنے پیروکاروں کو دیگر مسلمانوں کے پیچھے نماز پڑھنے اور ان کا ذبیحہ کھانے سے روکا، ان سے شادی بیاہ کو ممنوع قرار دیا، مسلمانوں کے بلاد کو دار الحرب قرار دیا۔ ان کے ہاں شادی شدہ زانی کی حد فقط کوڑے ہیں اس لیے کہ رجم قرآن سے ثابت نہیں۔ وارث کے لئے وصیت جائز ہے۔ رضاعت کی وجہ سے فقط دودھ پلانے والی ماں اور بہن حرام ہو جاتی ہیں (73)۔

خوارج مختلف چھوٹے بڑے مسائل میں اختلافی مراحل سے گزر کر بیس کے قریب فرقوں میں تقسیم ہو گئے، جن میں اکثر و بیشتر ہر وقت اختلاف نمودار ہوتا لیکن بحیثیت مجموعی دو نظریات: نظریہ خلافت اور نظریہ ایمان و عمل کی وحدت میں تقریباً ایک موقف کے قائل رہے (74)۔

فقہ اسلامی پر خوارج کے اثرات:

فقہ خوارج کے آراء سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ خوارج ایک طرف صرف قرآن کے ظاہر سے استدلال پر اکتفاء کرتے اور بعض احادیث کو قبول کرتے، جبکہ دیگر سینکڑوں روایات کو رد کر دیتے۔ اپنے موقف کے حامل علماء کی طرف میلان اور تعصب مذہبی جبکہ دیگر علماء کی آراء پر طعن و تشنیع نے فرقہ بندی اور قابل مذمت تعصب کا دروازہ کھولا، جس نے بالاخر یہاں تک پہنچایا کہ اپنے مفید مطلب بعض روایات گھڑنے اور دیگر افراد کی صحیح روایات کی تردید شروع کی۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ حدیث نے خوارج کی طرف میلان رکھنے والے بعض راویوں سے روایت ترک کی۔

انہوں نے جمہور مسلمانوں کے ساتھ استدلال و استنباط کے مصادر، فتاوی اور فقہی آراء میں اختلاف کیا۔ بعض خوارج نے سنت کو چھوڑ کر صرف قرآن پر اکتفاء کرنے پر اصرار کیا جب کہ بعض نے اجماع کا انکار کیا، چنانچہ منطقی تقاضہ یہ تھا کہ جمہور امت اور شیعہ حضرات نے ان کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جن کا مظاہرہ انہوں نے خود جمہور کے ساتھ کیا، ہر جماعت نے دوسری جماعت کے آراء و اقوال کو چھوڑ دیا جو فقہی افتراق کا سبب بنا (75) لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ ان کے برخلاف جمہور امت نے ان روایات کو بھی قبول کیا ہے جن کے راویوں کا تعلق دوسرے فرقوں سے ہے (76) بشرطیکہ وہ قبولیت روایت کے قواعد و اصول پر پوری اترتی ہو

شیعہ:

یہ فرقہ اہل بیت سے محبت کے نام پر نمودار ہوا۔ ابتداء میں اس جماعت پر اہل بیت کے ساتھ عقیدت ومحبت کا غلبہ ہوا جو اہل بیت کی تقدیس پر منتج ہوا، اور اس رجحان نے استحقاق خلافت کے نظریہ تک پہنچایا بعد ازاں اس پر عقیدے کا رنگ چڑھا پھر ایک مذہبی سیاسی تحریک کے بعد ایک مذہبی فرقہ اور مخصوص فقہی مکتبہ فکر کی شکل اختیار کی۔

ان حضرات کا نقطہ نظر یہ تھا کہ خلیفہ مشورے سے منتخب نہیں ہوتا، خلافت کا مسئلہ شوری کے دائرے سے باہر ہے۔ اس منصب کے لئے ضروری ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نص یا وصف کے ساتھ کسی کو منتخب کیا ہو یا پھر جس شخص کے بارے میں وصیت کی ہو وہی مسلمانوں کا خلیفہ ہوگا، چنانچہ ان کے نزدیک نبی اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ کی خلافت کی وصیت کی تھی اور یہ کہ حضرت علیؓ کی اولاد آپؓ کے بعد منصب خلافت کے حقدار ہیں(77)۔ یہ امانت حضرت علیؓ کی اولاد میں منحصر رہے گی ان سے اس صورت میں نکل سکتی ہے، کہ کسی غیر نے ان پر ظلم کیا ہو، یا ان ائمہ میں کسی نے تقیہ کیا ہو، وگرنہ مسئلہ امامت کا دارو مدار اقتضاء اور مصلحت پر نہیں جنہیں عام لوگوں کے اختیار پر چھوڑ دیا جائے اور وہ اپنے میں سے کسی کو امام چن لیں بلکہ یہ اصولی معاملہ ہے، اور دین کا ایسا رکن ہے، جس سے غفلت کرنا، مہمل چھوڑنا اور عام لوگوں کو تفویض کرنا رسول اللہ ﷺ کے لئے جائز نہیں اور یہ کہ ائمہ صغائر و کبائر سے وجوبا معصوم ہیں(78)۔

اگرچہ اہل تشیع کی فقہ کا دارومدار بھی کتاب وسنت پر ہے، لیکن اپنے انفرادی تشخص اور مخالفین کے بارے میں بدگمانی نے ان کے دین کو ایک خاص رنگ دیا ہے، جو خوارج اور اہل السنۃ والجماعۃ کے فقہ سے مختلف بلکہ بسا اوقات متضاد ہے، ان کے نزدیک حضرت علی تمام مخلوق میں افضل اور بشمول باقی ائمہ معصوم ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی خصوصیات اور امتیازات کی وجہ سے جنت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں، ان کا جو مخالف ہوگا وہ کفار ومنافقین کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا مستحق ہوگا(79)۔

اہل تشیع کے ان اعتقادات اور افکار نے ان کے فقہ پر مخصوص اور انمٹ اثرات مرتب کیے۔ ان کے ہاں دین فقط ائمہ معصومین سے لیا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ ائمہ، انبیاء کی طرح معصوم ہیں، اور انکے علاوہ دوسرے مکاتب فکر کے فقہاء کی یہ حیثیت نہیں۔

یہ حضرات قرآن مجید کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو ان کے معتقدات اور اصول کے ساتھ متفق ہو۔ ان کے علاوہ کسی بھی تفسیر پر اعتماد نہیں کرتے۔ ان کے ہاں وہ احادیث سند قبولیت پالیتی ہیں جو ائمہ معصومین اور اہل بیت کے طریق سے آئی ہو۔ ان ائمہ معصوین کے علاوہ دوسرے محدثین کی روایات ناقابل قبول ہیں چاہے سند کے اعتبار سے کتنی مضبوط کیوں نہ ہوں۔ اہل سنت سے یہ احادیث کی طرح اصول وفروع میں کوئی مسئلہ قبول نہیں کرتے، چاہے صحت کے وہ اعلی مرتبہ کی حامل کیوں نہ ہو۔ ان میں سے بعض حضرات اجماع امت کو تشریع اسلامی کا اصل نہیں مانتے۔ اجماع کا انکار اس وجہ سے کرتے کہ اجماع کی قبولیت کی صورت میں صحابہ وتابعین میں سے غیر شیعہ حضرات کے اقوال کو تسلیم کرنا پڑے گا، جب کہ ان کے ہاں یہ حضرات کسی بھی دینی مرتبے کے لائق

نہیں اور نہ اپنے ائمہ کے علاوہ کسی کی عصمت کے قائل ہیں۔ ان کے ہاں فقط اہل بیت کا اجماع معتبر ہے(80)۔

ان میں سے بعض لوگ قیاس کی حجیت کے قائل نہیں، قیاس کی حجیت سے انکار اس دلیل پر مبنی ہے، کہ قیاس رائے کا دوسرا نام ہے، اور دین رائے سے نہیں بلکہ اللہ، رسول اور ائمہ معصومین سے حاصل کیا جائے گا(81)۔

ان کے ان خیالات اور نظریات کا اثر فروعی احکام پر پڑنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں فقہ کا دائرہ بہت تنگ اور محدود ہے، بہت ساری صحیح احادیث، روایات اور اصول کو محض اس وجہ سے ترک کیا جاتا ہے کہ ان کے حاملین شیعہ حضرات نہیں، چنانچہ دیگر فرقوں کے ساتھ اصول میں مخالفت، فروع میں بھی اختلاف کا سبب بن گئی۔ یہ حضرات متعہ کے جواز کے قائل ہیں ان کے نزدیک کسی مسلمان کے لئے کتابیہ عورت سے نکاح جائز نہیں، غیر منقول جائیداد میں عورت وارث نہیں بن سکتی، انبیاء کی میراث تقسیم کی جاتی ہے۔ میراث تمام ذوی الفروض کی موجودگی کی صورت میں صرف اقرب کو ملے گی(82)۔

اہل السنۃ والجماعۃ:

اہل السنۃ والجماعۃ کا اطلاق ان دونوں مذکورہ فرق کے علاوہ ان حضرات پر ہوتا ہے، جنہوں نے ان معاملات میں اعتدال کا دامن تھامے رکھا، یہ حضرات حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے، اور اپنے وقت پر آپ کو خلیفہ مانتے رہے، اور آپ سے پہلے تینوں خلفاء راشدین کی خلافت کو صحیح اور برحق جانتے تھے۔ ان کے اعتقاد میں خلافت وصیت سے ثابت نہیں ہوتی بلکہ خلیفہ مسلمانوں کے باہمی مشورے سے منتخب ہوتا ہے، ان کے نزدیک تمام صحابہؓ عادل ہیں، ان کے درمیان جو اختلافات واقع ہوئے وہ اجتہادی تھے، اصول وفروع اور مصادر شریعت میں یہ حضرات ان خطاؤں سے کنارہ کش رہے، جن کا ارتکاب ان فرق نے کیا تھا، یہ افراط وتفریط سے خالی جادہ اعتدال پر قائم جماعت تھی(83)۔

شیعہ اور خوارج کے برعکس ان کے ہاں صحیح روایت کسی بھی راوی سے مقبول سمجھی جاتی تھی۔ لیکن اس دور میں چونکہ شیعوں کے کئی فرقے پیدا ہوگئے اور ہر فرقہ نے علم دین کو اپنے اپنے ائمہ اور ان کے رفقاء سے حاصل کیا، اس لئے یہ لوگ ان ائمہ کے متعلق جو اعتقادات رکھتے تھے، وہ اعتدال اور غلو کے اعتبار سے مختلف تھے، ان میں بعض لوگوں نے حضرت علیؓ اور اہل بیت کی تائید میں غلو سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے بہت سی ایسی حدیثیں روایت کی جن کی نسبت جمہور ائمہ (اہل السنۃ) یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ بالکل جھوٹی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ائمہ نے جس طرح غالی خوارج کی روایتوں کو قبول کرنے میں تأمل کیا ہے اس طرح ہر غالی شیعہ یا داعی تشیع کی روایتوں کے قبول کرنے میں توقف کیا ہے(84)۔

مسئلہ خلافت میں سیاسی افتراق اور ہر جماعت کے مخصوص اعتقادات کی وجہ سے فقہ اسلامی پر اصولی اور فروعی دونوں اعتبار سے اثرات پڑے خوارج اور شیعہ صرف وہ احادیث قبول کرتے جو ان کے مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان کے نزدیک بعض اوقات مضبوط روایات صرف اس بنیاد پر قبول نہیں کی جاتی تھیں کہ ان کو روایت کرنے والے ان کے مخصوص میزان پر پورے نہیں

اتر تے تھے۔اہل تشیع اجماع اور قیاس کو شرعی حجت تسلیم نہیں کرتے تھے۔چنانچہ اعتقادات ،اصول اور مصادر شریعت میں اختلافات کی وجہ سے سینکڑوں فقہی فروع میں اختلافات واقع ہوئے(85)۔

خوارج،شیعہ اور اہل السنۃ مکاتب فکر میں امت مسلمہ کی تقسیم کے علاوہ اس دور میں دیگر عوامل بھی تھے جنہوں نے فقہ اسلامی کو کسی نے کسی لحاظ سے متاثر کیا ان میں چند ایک یہ ہیں۔

صحابہ کرام کا مختلف شہروں میں پھیل جانا:

خلیفہ اول و دوم حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی طرح خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کی خلافت کے اکثر حصہ میں فقہا صحابہؓ مدینہ میں سکونت پذیر رہے، یہ مدینہ سے بغیر ضرورت باہر نہ جاتے اور ضرورت کے بعد پھر لوٹ آتے ، جہاں خلیفہ وقت بوقت ضرورت ایسے تمام مسائل میں ان کی رائے لیتا جو اس کو درپیش ہوتے ۔خلافت کے مختلف شہروں کے والی ، قاضی اور دیگر حکام کے پاس جب کوئی حل طلب مسئلہ پیش آتا تو کتاب اللہ میں اس کا حکم تلاش کرتے ۔ یہاں نہ ملتا تو پھر سنت میں اس کی تفتیش کرتے ، یہاں بھی اگر حکم نہ پاتے تو اجتہاد کرتے ۔ایسے مسائل میں جن کا حل مطلوب ہوتا اور ان کے سلسلے میں خلیفہ وقت کی طرف مراجعت ہوتی،خلیفہ وقت کو اگر بذات خود بھیجے ہوئے مسئلے کا حکم معلوم ہوتا ۔تو وہی حکم ان قاضیوں اور والیوں کے پاس ارسال کرتے اور اگر خود حکم معلوم نہ ہوتا۔تو صحابہ کرام کی مشاورت سے اس کا حل ڈھونڈ نکالتے اور پھر اجرا اور تنفیذ کی غرض سے متعلقہ قاضی یا والی کو ارسال کیا جاتا تھا۔یہ طریقہ کار عموماً ان مسائل میں ہوتا جن پر اجماع اور اتفاق ہوتا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مدینہ میں موجودگی کی وجہ سے اکثر وبیشتر اجماع میں آسانی ہوتی تھی ۔ بہت کم ایسا بھی ہوا کہ اجماع نہ ہوتا بلکہ سوال بھیجنے والے قاضی یا والی کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا تاکہ ان آراء میں سے کوئی ایک (مناسب حال) رائے اختیار کرے یا پھر خلیفہ کی طرف سے کسی ایک رائے کا حکم دیا جاتا تو اطاعت امیر کی وجہ سے قاضی اور والی پر اس رائے کا نفاذ واجب ہو جاتا اور قانون سازی اور تشریع اس ڈگر پر جاری رہی(86)۔

خلفاء راشدین بالخصوص حضرت ابوبکرؓ و عمر رضی اللہ عنہم کے دَور میں خلیفہ وقت مدینہ میں کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی موجودگی ضروری سمجھتے تھے ۔تاکہ بوقت ضرورت ان سے مشورہ کیا جاسکے ، بالخصوص حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بالغ نظری اور دوراندیشی کی بدولت ان کو مستقلاً مدینہ چھوڑنے سے منع کیا اور مدینہ سے باہر ان کی مستقل سکونت پر چند ناگزیر وجوہات کے پیش نظر پابندی لگادی(87) تاکہ یہ حضرات خلیفہ وقت کے اہل مشورہ بنے رہے(88) اور مختلف مسائل وحوادث اگر پیش آئیں تو ان کی لیاقتوں اور مشورہ سے بروقت فائدہ اٹھایا جاسکے، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بہت زیادہ فیصلے ''اجماع'' پر ہوئے۔ کیونکہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدینہ میں موجودگی کی وجہ سے کسی فیصلہ پر متفق ہونا آسان تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کو مدینہ سے باہر جانے سے اس لیے بھی منع کیا تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ کو اس بات کا خطرہ تھا، کہ دوسرے شہروں میں آباد ہونے کی وجہ سے لوگ ان کی وجہ سے فتنہ میں پڑسکتے تھے، کیونکہ یہی وہ حضرات تھے، جن کی

آنکھوں نے جمال نبوت کو دیکھا تھا اور طویل مدت تک فیض رسالت سے مستفید ہوئے تھے، یا یہ بھی اندیشہ تھا کہ یہ حضرات مال غنیمت کے طور پر ملنے والے دنیاوی جاہ وجلال کی وجہ سے خود آزمائش کا شکار نہ ہو(89)۔

جب خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور کثرت فتوحات کی وجہ سے اطراف عالم میں ان حضرات کی ضرورت پڑگئی، تو آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے دَورِ خلافت میں یہ پابندی اٹھالی اور مختلف دینی اور ریاستی ضروریات کے پیش نظر صحابہؓ اسلامی ریاست کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ مختلف اسلامی شہروں میں معلمین، قارئین، مجاہدین، قضاۃ اہل فتویٰ، گورنر اور حاکموں کی حیثیت سے یہ حضرات آباد ہوئے(90)۔

یہ علاقے پہلے ہی سے اسلامی تعلیمات کے پیاسے تھے، اس لئے ان کے باشندے اپنے ہاں آنے والے صحابہ کرامؓ کی طرف، روایت وفتوی اور تعلیم وتربیت کے حصول کی غرض سے امڈتے چلے آئے، چنانچہ ان حضرات کی تعلیم وتربیت کے نتیجے میں مختلف علاقوں میں تابعین میں ایسے افراد تیار ہوئے جو ان کے بعد صحیح معنوں میں جانشین ثابت ہوئے۔ ان میں بعض تابعین ایسے تھے جو علمی مرتبہ میں بجاطور پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہم پلہ تھے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب علم میں برابر نہیں تھے، بلکہ مختلف تھے ان میں بسا اوقات بعض کے پاس علم دین کا جو ذخیرہ موجود تھا وہ دیگر حضرات کے پاس نہ تھا۔ ایک نے آپ ﷺ کی جتنی صحبت پائی دوسرے کو نہ ملی، لہٰذا بعض حضرات نے پیغمبر ﷺ سے جو احادیث لیں دوسرے اس سے ناواقف تھے۔

مزید برآں دور دراز شہروں میں آباد علماء کا آپس میں رابطہ کرنا اسباب مواصلات نہ ہونے کی وجہ سے مشکل تھا، پھر ان مختلف شہروں کی عادات، انواع معیشت، اقتصادی اور اجتماعی احوال میں بھی تنوع پایا جاتا تھا لہٰذا ہر فقیہ حکم شرعی کی معرفت کے لئے قرآن وسنت کی روشنی میں اجتہاد کرتا اور اس باب میں اسباب نزول اور مقاصد شریعت اور کبار صحابہؓ کے فتاویٰ سے بھرپور مدد لیتا، اور جس امر کو صواب سمجھتا اس کے مطابق فیصلہ کرتا، اور جس شرعی حکم تک پہنچ پاتا اسی کے مطابق فتویٰ دیتا(91)۔

اس طرح یہ حضرات اپنے اپنے علم اور ان علاقوں کے احوال وعادات کے تناظر میں مسائل کے استخراج کے لئے قیاس واجتہاد کرنے لگے، اور ان علاقوں کے باشندے ان اجتہادی فیصلوں اور فتاویٰ پر عمل کرنے لگے، اور یوں ہر شہر کے لئے اپنے اپنے مفتی اور فتاویٰ بن گئے۔ اہل کوفہ، اہل بصرہ، اہل مغرب، باشندگان مکہ اور مدینہ کے لئے مخصوص فتاویٰ وجود میں آئے(92)۔

باشندگان کوفہ عبداللہ بن مسعودؓ اور آپؓ کے شاگرد علقمہ النخعی اسود بن یزید اور مسروق الأجدع کے فتاوی پر عمل کرتے اہل شام کا عمل حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کے اقوال پر تھا، اہل مصر عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ کے مطابق عمل کرتے تھے(93)۔

فقہی مدارس کا ظہور:

ان سب احوال کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن وسنت کے اصولوں کے مطابق اجتہاد کے ذریعے حاصل ہونے والے احکام میں بھی اختلاف واقع ہوتا، بلکہ کبھی کبھی ایک ہی علاقے میں فتاویٰ اور آراء کا اختلاف ہوتا، اس طرح ہر علاقے اور شہر میں فقہی مسائل احادیث نبوی اور آیات الاحکام کی تفسیر اور اسباب نزول کی معرفت کا ایک مخصوص طرز وجود میں آتا جو وہاں آنے والے فقیہ صحابیؓ یا صحابہ کے رہین منت ہوتا، اور اسی طرز پر اصطلاحی طور پر "مدرسۃ" کا اطلاق ہوا(94)۔

بعد میں جب صحابہؓ کے تابعین شاگرد تیار ہوئے او انہوں نے اپنے اپنے استادوں کا راستہ اختیار کیا، اور انہوں نے صحابہ اساتذہ کے طرز اور اسلوب کو پروان چڑھایا۔ یہ حضرات بھی اپنے اپنے علم اور ان علاقوں کے احوال کے تناظر میں مسائل کے استنباط کے لئے قیاس اور اجتہاد کرنے لگ گئے اس طرح ہر علاقے کے لئے ایک طرف اپنے اپنے مفتی اور مخصوص فتاوی بن گئے تو دوسری جانب غیر عربی ممالک کے لوگوں کو شریعت اسلامی کے مسائل، ان کا تجزیہ اور ایک نئے انداز سے سوچنے کے کافی مواقع فراہم ہوئے اور اجتہاد واستنباط کے نئے اسالیب کی وجہ سے مختلف فقہی مدارس(95) کی ابتداء ہوئی اور ہر شہر کی طرف منسوب فقہی مدرسہ فکر بنا، جن میں مدرسۃ مکہ، مدرسۃ الیمن، مدرسۃ البصرۃ، مدرسۃ الشام اور مدرسۃ مصر مشہور ہیں(96)۔

مدرسۃ اھل الحدیث اور مدرسۃ اھل الرائے:

لیکن مجموعی طور پر دو مدارس نے شہرت پائی اور فقہاء اسلام دو مدرسہ ہائے فکر میں تقسیم ہوگئے، مدرسۃ اہل الحدیث و مدرسہ اہل الرائے(97)۔

① مدرسۃ الحدیث، اس مدرسہ فکر کے علمبردار ابتداء میں حجاز کے علماء وفقہاء تھے، اور مدینہ ان کا مرکز تھا۔ اس لیے یہ مدرسہ اہل مدینہ اور مدرسۃ الحجاز بھی کہلاتا ہے(98)۔

② مدرسۃ الرأی، دوسرے مکتبہ فکر کو مدرسۃ الرائے، مدرسۃ العراق اور مدرسۃ الکوفۃ کہا جاتا ہے، اگرچہ کوئی اسلامی شہر بھی ان دو مدرسہ ہائے فکر کے فقہاء سے خالی نہ تھا، لیکن مدرسۃ الحدیث کی اکثریت حجاز میں اور مدرسۃ اہل الرأے کی اکثریت عراق میں غالب رہی(99)۔

خلفاء راشدین کے عہد سے اجتہاد بالرأے، احکام کی علتوں اور مصالح کی رعایت کی بنیاد پر قائم تھا۔ قرآن وسنت کے اصولوں کی روشنی میں کسی مسئلہ کے حل کے لئے اجتہاد کیا جاتا، لیکن اجتہاد میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی دو جماعتیں تھیں کچھ اہل علم قرآن وسنت کو مسائل کے حل کے لئے کافی سمجھتے تھے اور شدید ضرورت کے بغیر رائے اور اجتہاد کو اختیار نہیں کرتے تھے اس باب میں تقویٰ اور احتیاط سے کام لے کر نصوص پر توقف اختیار کرتے اور ان سے تجاوز نہ کرتے، جب کہ دوسری جماعت سے تعلق رکھنے والے

اہل علم اجتہاد میں وسعت کے مالک تھے۔ یہ نصوص سے آگے بڑھ کر معانی پر غور کرتے، علتیں معلوم کرتے، اور ان معانی وعلل پر احکام کا دارومدار رکھتے(100) ان دونوں اجتہادی رجحانات کے حامل صحابہ رضی اللہ عنہم جب مختلف شہروں میں قاضی، مفتی، معلم اور گورنر بن کر گئے وہاں ان کے جو شاگرد تیار ہوئے، انہوں نے اپنے استاد کا طرز استدلال اور منہج استنباط اختیار کیا، اور اس طرح دونوں رجحانات پروان چڑھے۔

مدرسۃ اہل حجاز:

اس مدرسہ فکر کے فقہاء نصوص، آثار، اور ان کے ظاہری معانی کو مسائل وحوادث کے حل کے لئے کافی سمجھتے تھے۔ شدید ترین ضرورت کے بغیر اجتہاد بالرائے کو اختیار کرنے سے گریز کرتے تھے(١٠١) اس مدرسہ فکر کے علمبردار اور رئیس ابتداء میں حضرت سعید بن المسیب تھے۔ ان کی صوابدید میں حجاز کے فقہاء اور علماء علوم حدیث وفقہ میں زیادہ قابل اعتماد اور مضبوط ہیں، مدینہ منورہ نے علمی اور فقہی میدان میں بنیادی کردار ادا کیا، مدینہ منورہ عہد رسالت کے بعد اور خلفاء راشدین کے دور میں بھی دارالخلافہ اور دینی امور کا مرکز رہا۔ دارالخلافہ جب بعد میں کوفہ اور دمشق منتقل ہوا تو بھی مدینہ کی دینی حیثیت میں کوئی فرق نہ آیا اس لیے کہ یہ دارالہجرت تھا یہاں اسلامی قانون سازی ہوئی اور سنت نبوی پروان چڑھی اس لیے یہاں کے لوگ روایات پر عمل اور آثار پر مطلع ہونے میں تمام لوگوں سے بڑھ کر ہیں(102)۔

جب ان سے کسی مسئلہ میں پوچھا جاتا، تو یہ حضرات ان کا حل بالترتیب قرآن وسنت میں تلاش کرتے، پھر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار میں تلاش کرتے، رائے اور اپنی جانب سے فتویٰ دینے سے حتی الامکان احتراز کرتے۔ بسا اوقات فتویٰ دینے میں توقف اختیار کرتے۔ صرف واقعات (واقع شدہ مسائل) میں فتویٰ دیتے، جو مسئلہ پیش نہ آیا ہو ان کے بارے میں سوال کرنا اچھا نہ سمجھتے اور نہ فتویٰ دیتے تھے(103)۔

اس مدرسہ فکر کی خصوصیات میں سے ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصادر اجتہادیہ کے مقابلے میں ان کا زیادہ اعتماد نصوص پر ہوتا، رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور صحابہؓ کے فتاویٰ کو حوادث پر منطبق کرتے اور احکام کی علتوں میں تعمق سے کام نہ لیتے۔ نقل حدیث اور ضبط روایت میں متشدد تھے۔ اپنے علاوہ دوسرے حضرات کی ایسی روایات کو قبول نہ کرتے جن میں وہ منفرد ہوتے اور اہل حجاز میں سے ان کا کوئی مؤید نہ ہوتا۔ علماء حجاز کی روایات کو علماء عراق وشام کی روایات پر اولیت دیتے تھے۔ ان کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا اعتماد اس فقہی ذخیرے پر تھا، جو رسول اللہ ﷺ کے سنن، صحابہؓ کے اقوال اور فقہاء حجاز کے اجماع سے عبارت ہے، یہاں ایسے نئے مسائل بہت کم پیدا ہوتے، جن کا حکم کتاب وسنت یا اجماع میں نہ ملتا کیونکہ حجاز میں دیگر اقوام اور ان کے عادات ورسوم سے بہت کم واسطہ پڑتا تھا(104)۔

حجاز میں مدرسۃ الحدیث کی طرف عموماً میلان کے کئی اسباب پائے جاتے تھے:

① ان حضرات کے پاس نبی کریم ﷺ کی احادیث اور صحابہؓ کے اقوال کا عظیم ذخیرہ موجود تھا۔ خلفاء ثلاثہ کے فتاوی نیز کوفہ کی طرف دار الخلافہ منتقل ہونے سے قبل حضرت علیؓ کے فتاوی، دیگر صحابہؓ کے فتاوی اور مدینہ کے قاضیوں کے فیصلے موجود تھے۔

② خوارج، تشیع اور بدعت جیسے زیادہ تر فتنے مدینہ وحجاز میں موجود نہ تھے جو وضع حدیث یا حدیث میں کذب بیانی کا باعث تھے۔ جس کی وجہ سے یہاں کے فقہاء حجازی روایات کی قبولیت میں تشدد سے کام نہیں لیتے تھے۔
عصر نبوی ﷺ اور عہد خلفاء راشدین میں مدینہ کا جو ماحول اور احوال تھے ان میں اب تک کوئی قابل ذکر تغیر نہیں آیا تھا۔ اس لیے جو مسائل یہاں پیدا ہوتے، یہ عموماً سابقہ ادوار جیسے ہوتے، جن کا حل اور فتویٰ ان کے ہاں محفوظ آثار اور ذخیرہ سے باسانی معلوم کیا جاسکتا تھا۔

③ نصوص، آثار پر انحصار اور حتی الامکان رائے سے احتراز میں یہ حضرات اپنے شیوخ زید بن ثابتؓ عبد اللہ بن عمرؓ اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے متاثر تھے۔

④ اہل عراق کی متمدن زندگی، اور ان کے مسائل کے برعکس اہل حجاز کی زندگی سادہ اور صحرائی تھی۔ تجارت کی غرض سے محدود اسفار اور معمولی زراعت پر ان کا انحصار ہوتا، ان کے ہاں نت نئے مسائل بہت کم پیش آتے چنانچہ رائے کی کثرت استعمال کی وہ ضرورت اور اسباب یہاں موجود نہ تھے، جو اہل عراق کو درپیش تھے، انہی امور نے کتاب وسنت اور آثار سے احکام معلوم کرنے میں سہولت پیدا کی تھی(105)۔

مدرسۃ اہل الرائے:

حجاز میں مدرسۃ المدینہ کا معاصر عراق کا مدرسۃ الکوفۃ تھا۔ یہ مدرسۃ اہل الرائے کے نام سے مشہور ہوا، اس مدرسہ فکر کی فقہی قدر و قیمت مدرسۃ مدینہ سے کسی طور کم نہ تھی۔ لیکن ابتداء میں مدرسۃ الحجاز کی طرح اس کو شہرت حاصل نہ ہوئی، نہ اس کے آثار ظاہر ہوئے اور نہ اس کے آراء وافکار مشہور ہوئے۔ اور نہ اس کے نقطہ ہائے نظر آشکارہ ہوئے لیکن بعد میں جب اس کی قیادت وسیادت امام ابوحنیفہؒ اور آپ کے ساتھیوں کے ہاتھ آئی تو یہ مدرسہ فکر خوب چمکا(106)۔

ان کے خیال میں عراق وہ خوش نصیب شہر ہے جس میں زیادہ تر صحابہ کرامؓ رہ چکے ہیں کیونکہ یہاں کے دو ملاقے کوفہ اور بصرہ عساکر اسلامیہ کی چھاونیاں تھیں۔ کوفہ اور بصرہ سو فیصد مسلمانوں کی بستیاں تھیں۔ ان دونوں کا نقشہ سیدنا عمر فاروق نے خود بنایا تھا۔ یہاں پر اہل علم صحابہ تشریف لائے۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں کوفہ اسلامی مملکت کا دار الخلافہ بنا۔ حضرت علیؓ سے پہلے یہاں عبد اللہؓ بن مسعودؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ عمار بن یاسر (متوفی 37ھ) ابو موسی اشعریؓ، مغیرہ بن شعبہ، انس بن مالک (متوفی

93ھ) حذیفہ بن الیمان (متوفی 36ھ) عمران بن حصین (متوفی 52ھ) اوران کے علاوہ سینکڑوں ایسے صحابہ رہائش پذیر ہوئے جو علم وفضل کے مالک تھے (107)۔

صحابہ کرامؓ میں سے اس مدرسۃ فقہ کے ائمہ جن سے یہ مدرسہ متاثر ہوا، حضرت عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم تھے، حضرت عمرؓ کی تاثیر اس میں عبداللہؓ بن مسعود کی توسط سے اس طرح آئی کہ عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عمرؓ سے بہت متاثر تھے۔ فقہاء کرام کے ہاں سوائے چند مقامات کے ہر مقام پر ان دو حضرات کی آراء ایک ہیں (108)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

((لو سلک الناس واد یاً وشعباً وسلک عمر واد یاًو شعباً لسلکت وادی عمر و شعبه)) (109)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو اہل کوفہ کی تعلیم وتربیت کے لئے بھیجا تھا۔ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے مال غنیمت میں اہل الشام کو اہل کوفہ کے مقابلے میں زیادہ حصہ دیا جس پر اہل کوفہ نے شکایت کی تو آپؓ نے فرمایا کہ تم اس بات پر پریشان ہو رہے ہو کہ میں نے اہل شام کو تمہارے مقابلے میں زیادہ انعام دیا ہے، کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ مسافت پر رہتے ہیں جب کہ میں نے تمہیں ان کے مقابلے میں ام ابن عبد یعنی عبداللہ بن مسعودؓ کے ذریعہ فضیلت دی ہے (110)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اثرات مدرسۃ الکوفۃ پر اس لیے پڑے کہ آپ نے دار الخلافۃ کوفہ منتقل کیا (111)۔ جہاں آپؓ کے عقیدت مند کثیر تعداد میں آئے۔ حضرت علیؓ کی شہادت بھی یہاں ہوئی۔ کوفہ میں جن تابعین نے طویل عرصہ تک ان دونوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کسب فیض کیا، انہوں نے اس کی بنیاد پر ایک خاص اسلوب اور منہج کو جنم دیا، جو ان صحابہؓ کی اجتہادات کی روشنی میں مرتب ہوا۔ بالخصوص حضرت عبداللہ بن مسعود نے اہل کوفہ کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری بطریق احسن نبھائی جس کے نتیجے میں آپ کے شاگردوں کی ایک نسل تیار ہوگئی۔ جنہوں نے آپ کے اقوال وآراء کو اختیار کیا، جن میں چھ حضرات نے کافی شہرت پائی اور فقہاء ستہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان حضرات کے نام یہ ہیں، علقمہ بن قیس، اسود بن یزید النخعی (متوفی ۷۵ھ)، مسروق بن الأجدع الہمدانی (متوفی 63ھ)، عبیدہ بن عمرو سلمان (متوفی 72ھ) شریح بن الحارث، حارث بن الأعور (112)۔ ان حضرات سے کثیر تعداد میں علماء نے کسب فیض کیا، جن میں ابراہیم نخعی نے شہرت حاصل کی اور اپنے وقت میں اس مدرسہ فکر کے علمبردار اور بانی ٹھہرے (113)۔

اس مکتبہ فکر کا موقف یہ ہے کہ شریعت کے احکام معقول المعنی ہیں، جو کہ لوگوں کی مصلحت پر مبنی ہیں اور یہ احکام کچھ اصول و ضوابط کے اردگرد گھومتے ہیں، اور علتیں ان احکام کو منضبط کرتی ہیں، چنانچہ یہ حضرات ان علتوں اور حکمتوں کی تفتیش کرتے، جن کی وجہ سے یہ احکام مشروع کیے گئے ہیں اور ان علتوں کے وجود اور عدم کے ساتھ احکام کو مربوط سمجھتے تھے۔ بسا اوقات ان علتوں کی وجہ

سے بعض احادیث چھوڑ دیتے تھے۔ بالخصوص جب ان احادیث کے ساتھ ان کا تعارض پایا جاتا(114)۔ ان کے ہاں رائے کے استعمال میں وسعت اور فروع کی کثرت پائی جاتی تھی۔ یہاں ایک نئی فقہ پیدا ہوئی جس کو فقہ تقدیری کہا جاتا ہے۔

یہ لوگ فتوی سے نہیں گھبراتے تھے۔ بلکہ روایت حدیث اور رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت میں احتیاط کرتے تھے، کیونکہ مختلف فرقوں کے وجود سے وضع حدیث کا سلسلہ چل نکلا تھا، یہی وجہ ہے کہ قبولیت روایت میں یہ لوگ متشدد تھے۔

یہاں کی تہذیب وثقافت کے نتیجے میں عملی زندگی کے مسائل لامحدود تھے جب کہ نصوص محدود۔ اس لیے حتمی طور پر تشریع اسلامی کی عمومی روح کی رعایت کے ساتھ ان میں غور وفکر کی جھلک نظر آنا ناگزیر تھا(115)۔

عراق میں مذہب اہل الرأی جن وجوہات سے مشہور ہوا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

① یہ حضرات حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے متاثر تھے۔ اور آپؓ ہی نے عبد اللہ بن مسعود کو کوفہ بھیجا تھا۔ عبد اللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں میں سے ''فقہاء ستہ'' تیار ہوئے جن کے علوم سے کثیر تعداد میں تلامذہ نے استفادہ کیا اور ان تمام میں ابراہیم نخعی نے شہرت پائی اور مذہب اہل رائے کے علمبردار اور بانی رہے۔

② ان کے خیال میں عراق علمی اور فقہی اعتبار سے مدینہ سے کسی طور کم نہ تھا۔ عراق کے دو شہر کوفہ اور بصرہ مسلمان افواج کی چھاونیاں تھیں جہاں اہل علم صحابہ تشریف لائے۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں کوفہ اسلامی حکومت کا دار الخلافہ بنا اور ان اہل علم وفضل صحابہ بالخصوص حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے تابعین نے کسب فیض کیا انہوں نے اس بنیاد پر ایک خاص فقہی اسلوب اور منہج استدلال کو جنم دیا۔

③ اہل حجاز اور اہل عراق کے منہج میں جو فرق آیا اس کی وجہ یہ تھی کہ عراق خوارج، شیعہ اور دیگر فرقوں کا مرکز تھا، جہاں وضع حدیث اور کذب بیانی کا فتنہ مختلف اسباب کے پیش نظر شروع ہوا۔ اپنی طرف سے باتیں گڑھ کر پیغمبر ﷺ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں اس لئے یہاں کے علماء اور فقہاء نے قبولیت روایت کے لئے شروط وضع کیے۔ جب کہ مدینہ میں یہ اسباب موجود نہ تھے، اس لیے حجاز کی نسبت عراق میں ان شرائط پر پوری اترنی والی احادیث کی مقدار کم پڑ گئی۔ جب کہ دوسری طرف تہذیب وثقافت اور تمدنی طرز حیات کے حامل اقوام کا اختلاط ہوا، جس کے نتیجے میں مسائل پر پیچ بن گئے چنانچہ رائے کے استعمال کی کثرت ناگزیر ہوگئی۔ عراق، مدینہ کی طرح پہلے سے دینی مرکز نہ تھا۔ جس کی وجہ سے احادیث و آثار کی کمی تھی جب کہ مسائل زیادہ تھے۔ رائے کے استعمال کے بغیر ان کا حل ناممکن تھا چنانچہ ان مخصوص اسباب کی وجہ سے فقہ تقدیری کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو اجتہاد کے وسعت کی ایک شکل تھی اور پہلے معروف نہ تھی(116)۔

اس زمانے میں متعدد فقہی مدارس قائم ہوئے جس میں ان دونوں مدارس نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی، ان کی شہرت کی وجہ یا تو یہ تھی کہ ان دونوں مدارس نے اس وقت کے لحاظ سے تمام دینی مسائل کا احاطہ کیا ہوا تھا اور نئے مسائل کے شرعی حل کے لئے

تحقیق کی تھی۔اس کے علاوہ ان کے مخصوص امتیازی اور واضح اصول تھے جو دوسرے مدارس میں ہمیں مفقود نظر آتے ہیں، چنانچہ مدرسۃ مکہ کے امام عطاء بن ابی رباح تھے، مدرسۃ بصرہ کے علمبردار حسن بصری (متوفی 110ھ) تھے۔مدرسہ شام کی قیادت امام مکحول کے پاس تھی جبکہ مدرسۃ الیمن کے رئیس امام طاؤس تھے۔

ان مدارس بالخصوص مدرسۃ حجاز اور مدرسہ عراق کا منہج اور طرز استدلال اگرچہ آپس میں مختلف ہے لیکن ان کا منبع اور سرچشمہ ایک ہے، جن سے ہر دو مدرسہ فکر نے آب ہدایت لیا ہے، علامہ ابن القیم فرماتے ہیں:

((الدين والفقه و العلم انتشر فی الأمة عن أصحاب ابن مسعود و أصحاب زيد بن ثابت وعبد اللّٰه بن عمرو أصحاب عبد اللّٰه بن عباس فأما أهل المدينة فعلمهم عن أصحب زيد و عبد اللّٰه بن عمر وأما أهل مكة فعلمهم عن عبد اللّٰه بن عباس وأما أهل العراق فعلمهم عن أصحاب ابن مسعود))(117) .

اُمتِ مسلمہ میں دین، علم اور فقہ کی اشاعت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے تلامذہ کے ذریعے ہوئی۔ چنانچہ اہل مدینہ نے زید بن ثابتؓ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کے شاگردوں سے علم حاصل کیا۔ اہل مکہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے تلامذہ سے فیضیاب ہوئے اور اہل عراق کو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں نے سیراب کیا۔

اس زمانے میں کوئی اسلامی شہر ایسا نہیں تھا جو ان دونوں مدرسہ ہائے فکر کے حامل فقہاء سے خالی ہو۔ ان مدارس کے متبعین کے درمیان علمی مناقشے اور مناظرے ہوئے۔ جس نے فقہ اسلامی کو بھرپور فائدہ دیا اور آنے والی نسلوں کے لئے عظیم ذخیرہ چھوڑا یہاں تک کہ اہل حجاز کے مدرسۃ الحدیث میں ایسے لوگ موجود تھے جو رائے کی طرف میلان رکھتے تھے اور علتوں اور حکمتوں کو تلاش کرتے تھے۔ بطور مثال ربیعہ بن عبدالرحمٰن (متوفی 136ھ) جو امام مالک کے استاد تھے اور ''ربیعہ الرائے'' کے نام سے مشہور ہیں اس طرح مدرسہ اہل عراق میں سے کوئی بھی ایسا فقیہ نہیں تھا کہ وہ سنت کو چھوڑ دے جب تک کہ اس کی نسبت ان کے شرائطِ قبولیت کے مطابق نبی کریم ﷺ تک ثابت ہو(118)۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مدرسہ فکر دوسرے کی تکمیل کرتا ہے اور دونوں مدرسے دینی خدمت، حقوق العباد کے تحفظ اور مصالح الناس کی رعایت میں ایک دوسرے کی تائید و توثیق کرتے ہیں۔

حواشی وتعلیقات

(1) ابن منظور الافریقی،لسان العرب،بیروت،دار الصادر،باب الھا فصل الفاء مادة "فقه"22/13

(2) سورة ھود:91

(3) سورۃطه:28-27

(4) الجرجانی،علی بن محمد بن علی،کتاب التعریفات، تحقیق ابراھیم الأبیاری،بیروت،دارلکتب العربی ط/ 1423,8ھ2002ء،ص:137

(5) زمخشری،جار اللّٰہ محمود بن عمر،الفائق فی غریب الحدیث،تحقیق،محمد ابوالفضل ابراھیم علی محمد،بیروت،دارالفکر،ط/1979,2ء،134/3

(6) ابن منظورالافریقی،لسان العرب"ماده فقه"522/13

(7) اسماعیل بن حماد الجوھری،الصحاح تاج اللغة وصحاح العربی، تحقیق احمد الغفور عطار ط/ 4، بیروت لبنان،دارالعلم للملا ئین،1987ء،2243/6

(8) ابن منظورالافریقی،لسان العرب"ماده فقه"522/13

(9) دکتورمحمد تاج عبد الرحمن العروسی،الفقه الإسلامی فی میزان التاریخ ،ط/2003,1ء،ص:13

(10) أبوعبداللّٰہ محمد بن اسمٰعیل،البخاری،الجامع الصحیح،16/1

(11) القاری،علی بن سلطان محمد،مرقاة المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح ،مکتبة امدادیه ملتان،2987/1

(12) سورۃالتوبه:122

(13) أبوعبداللّٰہ محمد بن اسمٰعیل،البخاری،الجامع الصحیح،دمشق، بیروت ، دار ابن کثیر،کتاب الوضوء باب وضع الماء عند الخلاء،66/1،حدیث رقم143

(14) الترمذی،محمد بن عیسی،جامع ترمذی،کتاب العلم،باب ماجاء فی الاستیصاء بمن یطلب العلم، الریاض،دارالسلام199ء،حدیث نمبر2650

(15) ابوداؤد،السنن،کتاب العلم،باب فضل نشرالعلم،تحقیق سعیدمحمداللحام،دارالفکر،179/2،حدیث3660

(16) أبوعبداللّٰہ محمد بن اسمٰعیل،البخاری،الجامع الصحیح مع فتح الباری،کتاب فرض الخمس،باب ماکان النبیؐ یعطی المؤلفة قلوبھم،بیروت دارالفکرللطباعة والنشر،التوزیع251/6

(17) أبوعبداللّٰہ محمد بن اسمٰعیل،البخاری،الجامع الصحیح، تخریج مصطفی دیب البغاء،ابواب التطوع،باب ماجاء فی التطوع مثنی مثنی391/1

(18) بحر العلوم ،عبد العلی،فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت،طبع نول کشورلکھنو1978ء،ص:8

(19) دائرۃ المعارف اسلامیہ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور ط/ 1971,1ء۔15 / 405-407

(20) فقہ کی یہ تعریف امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے منقول ہے: ملاعلی قاری حنفی، شرح الفقه الأكبر، قدیمی کتب خانہ کراچی، ص:10

(21) علم الکلام کی تعریف یہ کی گئی ہے: "هو علم يتضمن الحجاج عن العقائدالإيمانيه بالأدلة العقلية و الرد على المبتدعة المنحرفين فى الاعتقادات عن مذاهب السلف وأهل السنة"۔ دیکھئے: ابن خلدون: مقدمہ، موسسة الكتب الثقافية بيروت لبنان، ط/ 1994,1ء، 141/2

(22) بحر العلوم، عبدالعلى، فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، ص:12

(23) الموسوعة الفقهيه، كويت وزارة الأوقات والشؤن الإسلامية، 12/1

(24) الفاظ میں معمولی فرق اور تبدیلی کے ساتھ یہ تعریف تقریباً چاروں فقہی مسالک سے تعلق رکھنے اہل علم نے کی ہے دیکھئے:
ابن حاجب المالكى، جمال الدين ابوعمر وعثمان بن عمر بن ابى بكر ابن الحاجب مالكى، كتاب مختصر المتنهى الأصولى، مصر قاهره مطبعة كردستان العلمية، 1336ھ، ص:3

(25) فخر الإسلام البزدوى، اصول البزدوى برحاشہ كشف الأسرار، کراچی صدف پبلشرز، 12/1

(26) بحر العلوم، عبد العلى، فواتح الرحموت، شرح مسلم الثبوت، ص:8

(27) الشوكانى، ارشاد الفحول من علم الأصول، مصر 1937ء، ص:3

(28) على حسن عبد القادر، نظرة عامة فى تاريخ الفقه الإسلامى، مكتبة القاهرة الحديثه ط/ 1956,2ء، ص:8,9

(29) شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، ط/ 1352,1ھ، قاهره ادارة الطباعة المنيرة، 127/1

(30) السائيس، محمد على، تاريخ الفقه الإسلامى، بيروت لبنان، دار الكتب العلمية، ط/ 1410,1ھ/ 1990ء، ص:16

(31) سورة ابراهيم:1

(32) السائيس، محمد على، تاريخ الفقه الإسلامى، ص:16

(33) ہجرت کے سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ ابوبکرؓ، ابوبکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہ اور عبداللہ بن ارقم ساتھ تھے اور حضرت علیؓ کو امانتوں کی ادائیگی کی غرض سے مکہ میں جانشین کی حیثیت سے چھوڑا جو یہ فریضہ ادا کرنے کے بعد آپ ﷺ کے ساتھ مل گئے۔ ابن قتيبه ابو محمد عبد الله بن مسلم الدينورى، المعارف، ط/1 بیروت لبنان، دار الكتب العلمية، 1987ء، ص:66

(34) دیکھئے: خضری بک، العلامه، تاريخ التشريع الإسلامى، مصر المكتبه التجارية الكبرى، ط/ 1960,7ء، ص:459

(35) نفس المصدر ص:6

(36) نفس المصدر، ص:7

(37) سورة المائدة:3

(38) ابن قيم الجوزيه، شمس الدين ابو عبد الله محمد بن ابى بكر، إعلام الموقعين عن رب العالمين ط/ ۱۹۷۲،۱ء بيروت، دال الجيل للنشر والتوزيع والطباعة، 11/1

(39) چنانچہ روایت ہے: ماروی ان النبیﷺ قال لعمر وبن العاص یوماً:أحکم فی ھذہ القضیة، فقال عمرو:أجتھد وانت حاضر فقال نعم،ان أصبت فلک أجران وان أخطئت فلک أجر:الھیثمی،مجمع الزوائد 352/4، حدیث نمبر 7002

(40) ابو داؤد،سنن ابی داؤد، کتاب الأقضیة باب اجتھاد الرأی فی القضاء، 149/2، حدیث نمبر 3592

(41) ابن حجر عسقلانی،فتح الباری،قاھرہ ۱۳۴۸ھ ، کتاب المغازی، 309/7

(42) محمد سلام مدکور،المدخل للفقه الإسلامی،دار النھضة العربیة ط/1966,3ء، ص:61

(43) وحی کی دو قسمیں ہیں، ایک وحی متلو یا وحی ظاہر،اس میں الفاظ اور معانی دونوں اللہ تعالی کی طرف سے ہوتے ہیں۔ دوسری وحی غیر متلو یا وحی باطن اس میں معانی اور مضامین من جانب اللہ ہوتے ہیں، لیکن الفاظ کا جامہ آپﷺ پہناتے ہیں۔شرح المنار لابن عبد الملک بحوالہ المدخل للفقه الإسلامی، ص:62

(44) الد والیبی،المعروف،الاستاد،المدخل إلی اصول الفقه،مطبعه جامع سوریة،1949ھ،ص:11

(45) دائرة المعارف الإسلامیه اردو،مادة فقه، 402/15

(46) علی حسن عبدالقادر،نظرة عامة فی تاریخ الفقه الإسلامی، ص:57

(47) امام مالک،مؤطا امام مالک ،کتاب القدر ،باب النھی عن القول بالقدر (الریاض ، دار النفائس ط/1 ، دار احیاء التراث العربی ط/1، 1418، 1997ء، ص، 553، حدیث نمبر 3338

(48) السائیس،محمد علی،تاریخ الفقه الإسلامی، ص48

(49) دکتور محمد تاج عبد الرحمن العروسی، الفقه الإسلامی فی میزان التاریخ، ص79

(50) سورة المائدة:3

(51) ابو داؤد،سنن ابی داؤد، کتاب القضاء باب اجتھاد الرای فی القضاء 149/2؛ حدیث نمبر 3594

(52) محمد سلام مدکور،المدخل اللفقة الإسلامی،ط/1966,3، دار النھضة العربیة،ص:72

(53) ابو عبد الرحمن النسائی،السنن النسائی، کراچی قدیم کتب خانہ، کتاب أدب القضاء باب الحکم باتفاق اہل العلم 301/2

(54) علامه ابن القیم الجوزیة،أعلام الموقعین عن رب العلمین، 36/1

(55) نفس المصدر، نفس الصفحة

(56) عبد الخالق،الدکتور،حجیته السنة ، تقدیم طه جابر العلوانی،دار التربیة،دار السعدادی،ص:5

(57) الدارمی،السنن ۱/۱۷،حدیث نمبر 163

(58) دائرة المعارف الإسلامیه (اردو) مادہ فقہ،ص:103

(59) دکتور عبدالکریم زیدان، المدخل لدراسة الشریعه الا سلامیه، ط/6، مکتبۃ القدس موسہ الرسالہ، ص:118

(60) محمد سلام مدکور،المدخل للفقه الإسلامی،ص:72

(61) علاء الدین علی المتقی بن حسام الهندی،کنز العمال فی سنن الأقوال والأفعال،مؤسسة الرسالہ ،بیروت 1979ء،باب أداب العلم متفرقة

(62) ابن حجر العسقلانی، التلخیص الحبیر، باب أدب القضاء 18/6، حدیث نمبر2621حدیث کی پوری عبارت یہ ہے "عن مسروق قال کتب کاتب عمر هذا ما أری الله امیر المؤمنین عمر فانتهره وقال لا بل اکتب هذا ما رأی عمر فإن کان صواباً من الله وإن کان خطأ فمن عمر".

(63) ابو الفضل السید ابو المعاطی النوری،المسند الجامع ،54/10،حدیث نمبر3128

(64) محمد سلام مدکور،المدخل للفقه الإسلامی،ص:72

(65) ایضاً:ص:74

(66) آثار،اثر کی جمع ہے کسی چیز کا باقیماندہ حصہ،نشان،اصطلاحاً حدیث کا مرادف ہے یا صحابہ وتابعین کی طرف منقول قول وفعل یا وہ چیز جس کی نسبت صحابہؓ کی طرف ہو۔دیکھئے:محمد عبیداللہ الأسعدی،علوم الحدیث،مجلس نشریات اسلام کراچی نمبر۱۸،ص:19-18

(67) یہ روایت عبداللہ بن مبارک نے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلی سے نقل کی ہے"کہ میں نے ایک سوبیس صحابہ کو دیکھا جن میں سے ہر محدث کی خواہش ہوتی کہ اس کا دوسرا بھائی حدیث بیان کرنے کی ذمہ داری پوری کرے اور ہر مفتی اس بات کو پسند کرتا کہ کوئی دوسرا فتوی دینے میں اس کی طرف سے کفایت کرے۔الدارمی،السنن 53/1-52

(68) حسین حامد حسان،المدخل لدراسة الفقه الإسلامی،ص:58-57

(69) السائیس،محمد علی،تاریخ الفقه الإسلامی،ص:72

(70) دکتورمحمد تاج عبد الرحمن العروسی،الفقه الإسلامی فی میزان التاریخ،ص:106

(71) التقیة الاظهار باللسان خلاف ما ینطوی علیه القلب للخوف علی النفس:تفصیل کے لئے دیکھئے:احمد فهمی محمد، تعلیق وتصحیح علی الملل والنحل للشهرستانی،لبنان دار السرور ط/1948ء،1 /ص194 حاشیہ نمبر1

(72) عبد الکریم الشهر ستانی، الملل والنحل،ط/۱، بیروت لبنان،1918ء،170/1

(73) الحجوی،محمد بن الحسن،الفکر السامی فی تاریخ الفقه الإسلامی،المکتبة العلمیة،2/2

(74) دکتورمحمد تاج عبد الرحمن العروسی، الفقه الإسلامی فی میزان التاریخ،ص:108

(75) سعد جبالی عبد الرحیم،المدخل لدراسة الفقه الإسلامی، ص:173-172

(76) بدران،ابو العنین،الشریعة الإسلامیه،مطبع شباب الجامعه ،ص:118

(77) عبد الکریم الشهر ستانی،الملل والنحل،235/1-234

(78) خلیفہ چہارم حضرت علیؓ شہادت کے بعد ان کا موقف تھا کہ حضرت علیؓ نے ضرور اپنے بعد کسی کے لئے خلافت وامامت کی وصیت کی

ہے، جس طرح کہ نبی کریم ﷺ نے خود حضرت علیؓ کے لئے وصیت کی تھی، چنانچہ حضرت علیؓ کی اولاد میں سے کسی ایک کو منصب خلافت پر فائز کرنے کے لئے جدوجہد دینی حق اور شرعی فریضہ ٹھہرتا ہے، فاطمی اولاد میں حضرت امام حسنؓ کی دستبرداری اور حسینؓ کی شہادت کے بعد علیؓ کی غیر فاطمی بیٹے محمد بن الحنفیہ خلافت کے حقدار ہے۔ ایک فرقے کا کہنا تھا کہ شہادت حسینؓ کے بعد خلافت حسنؓ کی اولاد کی طرف منتقل ہوگی جبکہ ایک فرقے کا موقف تھا کہ دستبرداری کی وجہ سے حسنؓ کی اولاد بھی خلافت کی حقدار نہیں رہے گی۔ یہ شیعوں کے اساسی تین فرقے بنے، بعد میں اس سے زیادہ فرقوں کا سلسلہ چل نکلا جو اپنے اپنے مخصوص امام کی طرف دعوت میں مشغول ہوا، اور مخصوص نام کے ساتھ موسوم ہوا۔ عقیدہ کی طرح فقہی نقطہ نظر سے بھی انہوں نے خوارج اور جمہور امت سے مختلف مذہب اختیار کیا۔ السائس ،تاریخ الفقہ الإسلامی،ص:75-74

(79) دکتور محمد تاج عبد الرحمن العروسی، الفقہ الإسلامی فی میزان التاریخ، ص:109

(80) سعد جبالی عبدالرحیم،المدخل لدراسۃ الفقہ الإسلامی،ص:177

(81) حسین حامد حسان،المدخل لدراسۃ الفقہ الإسلامی،ص:58

(82) سعد جبالی عبدالرحیم،المدخل لدراسۃ الفقہ الإسلامی، ص:189-178

(83) دکتور محمد تاج عبد الرحمن العروسی، الفقہ الإسلامی فی میزان التاریخ ، ص:110

(84) الخضری،تاریخ التشریع الإسلامی، ص:169

(85) یوسف موسی،الدکتور،المدخل لدراسۃ الفقہ الإسلامی،دارالفکر العربی ،ص:39

(86) سعد جبالی عبدالرحیم،المدخل لدراسۃ الفقہ الإسلامی، ص:185-184

(87) السائیس،محمد علی،تاریخ الفقہ الإسلامی ،ص:77

(88) حسین حامد حسان،المدخل لدراسۃ الفقہ الإسلامی،ص:59

(89) محمد یوسف موسی، المدخل لدراسۃ الفقہ الإسلامی،ص:49

(90) حسین حامد حسان،المدخل لدراسۃ الفقہ الإسلامی،ص:59

(91) دکتور محمد تاج عبد الرحمن العروسی، الفقہ الإسلامی فی میزان التاریخ ، ص:111

(92) اہل مدینہ کا عمل حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت سعیدؓ بن المسیب اور حضرت عروہؓ بن زبیر کے فتویٰ پر ہوتا، اہل مکہ حضرت عبداللہ بن عباس اور آپ سے فیض یاب ہونے والے تابعین مجاہد بن جبیر، عطاء بن ابی رباح اور طاؤس بن کیسان کے فتاوی پر عمل پیرا ہوتے
السائیس، تاریخ الفقہ الإسلامی، ص:78

(93) علامہ ابن القیم الجوزیہ،اعلام الموقعین عن رب العلمین، قاھرہ دار الحدیث،ص:71-27

(94) سعد جبالی عبدالرحیم، المدخل لدراسۃ الفقہ الإسلامی،ص:177-175

(95) مدارس سے مراد درس وتدریس کے لئے تعمیر شدہ مکان نہیں بلکہ استدلال کے مخصوص طرز اور استنباط کے مخصوص منہج کا استعمال ہے دیکھئے:الموسوعۃ الفقھیہ،دولت کویت،ص:29

(96) العروسی،الفقہ الإسلامی فی میزان التاریخ ،ص:114-116

(97) عبد الکریم زیدان،المدخل لدراسۃ الشریعۃ الإسلامیہ، ص:136

(98) دکتورمحمد تاج عبد الرحمن العروسی، الفقہ الإسلامی فی میزان التاریخ، ص:120

(99) حسین حامد حسان،المدخل لدراسۃ الفقہ الإسلامی، ص:62

(100) عبد الکریم زیدان،المدخل لدراسۃ الشریعۃ الإسلامیہ ، ص:136

(101) نفس المصدر،ص:137

(102) سعد جبالی عبدالرحیم،المدخل لدراسۃ الفقہ الإسلامی،ص:210-209

(103) السائیس،محمد علی، تاریخ الفقہ الإسلامی،ص:85-74

(104) دکتورمحمد تاج عبد الرحمن العروسی، الفقہ الإسلامی فی میزان التاریخ، ص:121

(105) عبد الکریم زیدان ، المدخل لدراسۃ الشریعۃ الإسلامیہ، ص:139

(106) سعد جبالی عبدالرحیم، المدخل لدراسۃ الفقہ الإسلامی، ص:217

(107) السائیس،محمد علی،تاریخ الفقہ الإسلامی ،ص:86

(108) سعد جبالی عبدالرحیم، المدخل لدراسۃ الإسلامی،ص:218

(109) علامہ ابن القیم الجوزیۃ، اعلام الموقعین عن رب العلمین، 15/1

(110) نفس المصدر 13/1

(111) سعد جبالی عبدالرحیم،المدخل لدراسۃ الإسلامی،ص:218

(112) فقہائے ستہ کے تراجم کے لئے دیکھئے:ابن العماد،شذرات الذہب، 135/1۔ ابن حجر، الإصابہ فی تمیز الصحابہ 23/3۔ الأصفہانی،حلیۃ الأولیاء، 176/2۔ ابن القیم،اعلام الموقعین ۔العروسی،الفقہ الإسلامی فی میزان التاریخ ص:123

(113) عبد الکریم زیدان، المدخل لدراسۃ الشعریۃ الإسلامیہ، ص:140

(114) السائیس،محمد علی، تاریخ الفقہ الإسلامی،ص:75

(115) سعد جبالی عبدالرحیم،المدخل ،ص:220-219

(116) عبد الکریم زیدان، المدخل لدراسۃ الشریعۃ الإسلامیہ، ص:140-138

(117) علامہ ابن القیم الجوزیۃ، اعلام الموقعین عن رب العلمین، 16/1

(118) حسین حامد حسان،المدخل لدراسۃ الفقہ الإسلامی، ص:66